ابراھیم اشک:
افسانے اور تجزیے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ابراهیم اشک:

افسانے اور تجزیے

ایک نے ہندوؤں سے کہا، 'ہم اپنی سبھیتا اور سنسکرتی کو بھولتے جا رہے ہیں، اپنے دھرم کی طرف ہمارا دھیان نہیں ہے، ہمارے مندر ویران ہوتے جا رہے ہیں۔ شہر کے باہر ویران پڑا مندر ہمیں بلا رہا ہے، ہمیں اس کی دیکھ بھال کرنی چاہئے، اس کا نونرمان کرنا چاہئے، ورنہ ایشور کا پرکوپ ہم پر ٹوٹ پڑے گا اور ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔'

چار دن بعد وسنت پنچمی تھی۔ ہندوؤں کو ایک اچھا بہانہ ہاتھ لگ گیا۔ ہزاروں کا جلوس بنا کر وہ اس جگہ پر پہنچے اور پوجا ارچنا کی۔ سب کو ایسا لگ رہا تھا جیسے انھوں نے کوئی بہت بڑی جنگ جیت لی ہو۔ سب باؤلے ہو رہے تھے اور پھولے نہیں سما رہے تھے۔ مذہب انسان کو بلاوجہ باؤلہ بنا دیتا ہے۔ آدمی پھر اپنے آپے میں نہیں رہتا ہے۔

مسلمان بھلا کب چپ بیٹھنے والے تھے۔ اس بار جمعہ کا دن آیا تو سب نے شہر کی جامع مسجد کے بجائے اسی فالتو جگہ پر نماز ادا کرنے کی ٹھان لی جہاں ہندوؤں نے پوجا کی تھی۔ شہر میں کافی تناؤ پھیل گیا تھا۔ جگہ جگہ پولیس کی ٹکڑیاں موجود تھیں۔ مسلمانوں نے جمعہ کی نماز ادا کی اور واپس پلٹ رہے تھے کہ کہیں سے کسی نے گلال پھینکنا شروع کر دیا، پتھر بازی ہونے لگی، پولیس نے آنسو گیس کے گولے چھوڑے اور بھیڑ کو تتر بتر کرنے کے لیے گولیاں چلائیں۔ کئی لوگ گھائل ہو گئے شہر میں کرفیو لگ گیا۔

وہ دونوں اپنی اپنی برادری کو بھڑکانے میں لگے ہوئے تھے۔ شہر میں جو سد بھاؤنا کا ماحول تھا اس میں زہر گھل گیا تھا۔ محبت نفرت میں بدلتی جا رہی تھی، صدیوں کے انسانی رشتے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ انسانیت کا قتل ہو رہا تھا۔ وحشت سر عام ننگی ہو کر ناچ رہی تھی۔ امن پر خطرے کے بادل منڈلا رہے تھے۔ آپسی میل جول میں دراڑیں پڑتی جا رہی تھیں۔ وشواس شک میں بدلتا جا رہا تھا۔ ہندو سچا ہندو نہیں رہ گیا تھا، مسلمان سچا مسلمان نہیں رہ گیا تھا۔ سب کے دھرم ایمان خراب ہو گئے تھے۔ سب ہی جانور بنتے جا رہے تھے۔ لوگوں کی صحیح طور پر سوچنے سمجھنے کی شکتی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ مذہبی افیم کا اثر لوگوں کے دل و دماغ پر گہرا ہوتا جا رہا تھا، وہ دماغی طور سے فالج کے شکار ہو کر رہ گئے تھے۔

دونوں نکمّے لوگ برادری کی نظروں میں اونچے اٹھنے لگے تھے، ان کی حیثیت بنتی جا رہی تھی، ان کی باتوں پر برادری والے عمل کرنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ جان دینے کے لیے بھی تیار تھے۔ اچانک ایک جگہ دونوں کی ملاقات اکیلے میں ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے ملے۔ ایک نے دوسرے سے کہا، 'دھندہ تو چل نکلا ہے بھیڑ بس ذرا ساز و راور لگانے کی دیر ہے، ہر

ڈاکٹر عبید الرحمٰن

تجزیہ — شاہ بیگم

ابراہیم اشک کی شناخت کے کئی حوالوں میں ایک حوالہ افسانہ نگاری بھی ہے۔ شاعری میں جس طرح وہ کسی مصلحت کے شکار نہیں اور صرف وہ کہتے ہیں جو اُن کا باطن ان سے کہلوانا چاہتا ہے، اسی طرح ان کے افسانے پڑھتے ہوئے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ حقیقت پسند ہی نہیں بلکہ حقیقت نگار بھی ہیں۔ ابراہیم اشک جس طرح فارمولہ بند طریقہ سے شاعری نہیں کرتے اسی طرح معین کلیہ کے تحت افسانے بھی نہیں لکھتے۔ اندر سے کوئی آواز آئی، کوئی ارتعاش پیدا ہوا، کوئی اضطرابی کیفیت جاگی تو قلم سنبھالا اور کاغذ پر سچائی ابھر آئی۔ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ انہوں نے اس کی ابتدا ہی تب کی جب معاشرہ میں ایک سازش کی بو پھیلنے لگی تھی۔ اس کا جواب ادیب دے رہے تھے، نہ صحافی اور نہ ہی میڈیا اور جو دے بھی رہے تھے وہ کافی حد تک حقیقت سے منحرف تھے۔ معاملہ تھا مشہور زمانہ شاہ بانو کیس کا۔ اس پس منظر میں ایک کہانی منظر عام پر آئی تھی مگر اس میں حقیقت غائب تھی لہٰذا قارئین گمراہ ہو گئے۔ اس غلط بیانی پر ایک جینوئن فنکار تڑپ اٹھا اور بھیڑ میں سے جن کی آواز اٹھی وہ ابراہیم اشک تھے۔ انہوں نے اس دھند کو صاف کرنے کے لیے جو افسانہ لکھا وہ ''شاہ بیگم'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ یہ اشک کا اولین افسانہ تھا جو انہوں نے اصلاحی اور مقصدی میلان کے تحت لکھا یا یوں کہا جائے کہ لکھنا پڑا ورنہ لوگ معاملہ کی اصلیت سے بے خبر رہتے اور ایسی غلط بیانی مسلم معاشرہ کے لیے جتنی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی، ہوئی۔ لہٰذا ابراہیم اشک نے اس افسانہ سے مصلحانہ انداز فکر کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ معاشرتی زندگی کی صالح قدروں کو استحکام بھی بخشا۔

شاہ بیگم کے حوالے سے گفتگو کے پہلے افسانہ کے مزاج و اسلوب کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ اُردو افسانہ کی ارتقائی تاریخ اس کے مزاج و اسلوب میں نمایاں تبدیلی کی غماز ہے۔ روحانی عناصر تقریباً ختم ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ واقعیت شعاری اور حقیقت نگاری نے لے لی ہے۔

شاعری میں بھی یہی صورت حال ہے جہاں حسن ومحبت اور خواب وخیال کو خارجی اور داخلی کشمکش نے بے اثر کر دیا ہے۔ لہٰذا آج کا افسانہ یا آج کی شاعری عصری زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس آئینہ میں صورتیں کس حد تک واضح ہیں کہ یہ تو فنکار کی حقیقت پسندانہ بصیرت، اس کے تخلیقی اور تجزیاتی شعور اور اس کی بے باکی پر منحصر ہے۔ اکثر فنکار اسی مقام پر اپنا اعتبار کھو بیٹھتے ہیں اور حقیقت اس شکل میں ظاہر نہیں ہو پاتی جو اس کی اپنی ہوتی ہے۔ مگر اطمینان کی بات ہے کہ ایسے بامقصد تخلیقی میلان کے ساتھ بہت سے افسانہ نگاروں نے انصاف برتا ہے۔ سجاد ظہیر، کرشن چندر، عزیز احمد، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، پریم چند، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، قرۃ العین حیدر، جوگندر پال، احمد یوسف، جیلانی بانو، شفیع مشہدی، شوکت حیات، ذکیہ مشہدی، غضنفر، انیس رفیع، احمد صغیر، سید جاوید حسن اور رحمٰن شاہی وغیرہ ایسے چند نام ہیں۔ ایسی ہی فہرست میں ابراہیم اشک بھی شامل ہیں جن کے یہاں اقدار کی حمایت، معاشرتی زندگی کی محرومیاں، حیات انسانی کی صداقتیں، رنج وراحت، آرائشیں اور آزمائشیں سب کچھ فنی لوازم کے ساتھ موجود ہیں۔

اشک کا افسانہ 'شاہ بیگم' حقیقت پسندانہ اسلوب کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ ایک شوخ، سرکش اور باغی عورت کی کہانی ہے جس سے بچپن میں اس کے والدین پریشان رہے اور شادی کے بعد اس کا شوہر اور سسرال والے۔ محبوب احمد اپنی بیوی سے کبھی عزت نہیں پا سکے بلکہ اس نے انہیں سماج میں حد درجہ رسوا کیا، وہ سماج جس میں بطور وکیل اُن کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ مگر محبوب احمد کبھی اپنے فرائض سے پیچھے نہیں ہٹے اور بیوی کی تمام تر بے اعتنائیوں کے باوجود اسے قریب رکھنے کی کوشش کی۔ جب صورت حال حد درجہ بگڑ گئی اور بات عدالت تک جا پہنچی تو انتہائی مجبوری کی حالت میں طلاق نامہ لکھ دیا اور شریعت کے قانون کے مطابق علاحدگی چاہی۔ مگر شاہ بیگم کا وکیل مائیکل اسے اکساتا رہا اور طلاق کے اس معاملہ کو ملک گیر سطح پر مسلمانوں کے خلاف فضا سازی میں استعمال کیا، نتیجے کے طور پر بڑے بڑے لیڈروں سے لے کر اسلام دشمن تنظیمیں صف آرا ہو گئیں اور شاہ بیگم کی حمایت میں سڑکوں پر اتر آئیں۔ پھر جو کچھ بھی ہوا اسے سب نے دیکھا کہ کس طرح مسلم پرسنل لال کی دھجیاں بکھیری گئیں اور نام نہاد مسلم لیڈر بھی خاموش تماشائی بنے رہے جب کہ اسلامی شریعت کے خلاف طلاق کے بعد بھی بیوی کو نان ونفقہ دینے کا فیصلہ لیا گیا تھا۔

افسانہ میں ایک ضمنی بیان بھی نوٹ کیا جانا چاہئے کہ جب شاہ بیگم کا اپنی بہو سے کسی

بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے اور وہ اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتی ہے تو وہی لوگ جو شاہ بیگم کو مظلوم سمجھتے ہوئے اس کی حمایت میں اتر آئے تھے، اب اس کے اس ظلم پر خاموش تھے۔ آخر کیوں؟ کہانی کار قاری کے لیے لمحۂ فکر پیدا کرتا ہے کہ اس کی تہہ میں مستقبل کی سازشیں پوشیدہ ہیں۔ کہانی کار کی ایمانی قوت کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''لیکن آخر جیت سچ کی ہی ہوگی، کیوں کہ جو حق ہے وہی شریعت ہے۔ وہی خدا کا قانون ہے، وہی خدا ہے اور خدا سے بڑا نہ تو دنیا کا کوئی ہائی کورٹ ہے نہ ہی سپریم کورٹ۔''

یہ اقتباس اس لیے نقل کیا گیا کہ تمام تر شور ہنگاموں کے بعد باطل حق کی طرف آیا۔ جب علمائے دین نے شاہ بیگم سے رجوع کیا، اسے سمجھایا، خوفِ خدا دلایا تو وہ عورت نرم پڑ گئی اور اس نے نان ونفقہ لینا بند کر دیا۔

کہانی میں جن حقائق کی جانب اشارے کیے گئے ہیں اور واقعات کو جس طرح ہو بہو پیش کر دیا گیا ہے ہمیں انہیں بس یوں نہیں سمجھنا چاہیے کہ افسانہ نگار نے محض سچی تصویر کشی کر دی ہے بلکہ جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو ان کی تہہ داری کے معترف ہوتے ہیں جو ہمیں پختگی شعور اور جوشِ عمل سے ہمکنار کرتی ہے۔

ابراہیم اشک ان افسانہ نگاروں میں ہیں جنہوں نے عصر حاضر کی زندگی پر تنقیدی نظر کی ہے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ دیکھا جائے تو ادب میں یہ نقطۂ نظر بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہلکی پھلکی تخلیقات اکثر کسی نقطۂ نظر سے عاری ہوتی ہیں یا اگر ہو بھی تو بہت معمولی سطح پر۔ افسانوں میں دوسری اصناف ہی کی طرح یہ نقطۂ نظر ہی ہے جو سنجیدہ قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اشک کے متعدد افسانوں میں ان کا نقطۂ نظر بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ تہذیب، زندہ تصویر، بیکری، رام جی کا دکھ اور سرحد وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ 'شاہ بیگم' میں واقعات اور کرداروں کے ذریعہ جن انسانی اقدار اور ان کی کشمکش کا اظہار ہوا ہے۔ اور جیسی تخلیقی بصیرت اور حیات آفریں سنجیدگی کے ساتھ ہوا ہے، وہ افسانہ نگار کے اس نقطۂ نظر کو واضح کرتا ہے کہ افسانہ اور زندگی لازم وملزوم ہیں۔ اس افسانہ کے ذریعہ اشک انسانی معاشرے کی خدمت اور اس کے خلاف استحصال پسندانہ میلانات کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں، ساتھ ہی اس کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں کہ ملک وقوم کی بہی خواہی ذاتی اغراض سے اوپر ہونی چاہیے۔ اشک کے افسانوں میں جس طرح کے احساسات موجزن ہیں وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے Manifesto سے کافی قریب

معلوم ہوتے ہیں۔ آزادی، انصاف طلبی اور حق پسندی سے متعلق خیالات کا اظہار جس بے باکی، جرأت اور لاگ لپیٹ کے بغیر ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ورنہ شاہ بانو معاملہ پر بہتوں نے اپنی روٹیاں سیکنی چاہی تھیں۔ ادیب بھی ان میں شامل تھے۔ مگر یہ ابراہیم اشک کا زندگی اور فن کے تئیں متوازن شعور تھا جس نے انسانیت کی کج روی اور خام کاری کو بے نقاب کیا اور شاہ بیگم جیسا عمدہ افسانہ لکھا جس میں مثبت، صالح اور تعمیری میلان موجود ہے اور جو اشک کی حقیقت شعاری کا آئینہ دار ہے۔ شاہ بیگم ایک سچے واقعے پر مبنی ہے اور اسی پس منظر میں افسانوی پلاٹ کی تعمیر کی گئی ہے۔ فارم اور تکنیک میں کوئی عجوبہ پن نہیں ہے تاہم پیشکش میں اتنی سادگی اور بے ساختگی ہے کہ قاری ضرور متاثر ہوگا۔

552/22, Zakir Nagar
New Delhi- 110025

☆☆

سانپ

پنڈت رام نارائن شاستری کی شادی ہوئے سات سال بیت گئے تھے لیکن اب تک اولاد کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ شام نرائن گاؤں کے شیو مندر کے پجاری تھے۔ اس مندر کی پوجا ان کے باپ دادا کرتے آئے تھے۔ گاؤں بھر میں شادی بیاہ اور پوجا پاٹھ بھی وہی کراتے اس لیے سارے گاؤں میں وہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ باپ شیو نارائن کی موت کے بعد کم عمری میں رام نارائن نے ذمہ داری سنبھال لی تھی، تب وہ سولہ سال کے تھے۔ ماں نے جلد ہی پڑوس کے گاؤں کی ایک سندر لڑکی پسند کر ان کی شادی بھی کرادی، لیکن سات سال تک اولاد نہیں ہوئی تو ان کی ماں فکر مند رہنے لگی۔ کئی بار وہ سوچنے لگتی کہ ان کی بہو جانکی بانجھ تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو ان کا ونش کیسے آگے بڑھے گا؟ وہ بہو کو بہت چاہتی تھی اس لیے رام نارائن کی دوسری شادی کرنے کے بارے میں جب بھی کوئی خیال ان کے ذہن میں آتا اسے فوراً جھٹک دیتی تھی۔ جانکی نے اپنی ساس اور پتی کا دل جیت لیا تھا۔ بس کمی تھی تو اولاد کی، جس کے لیے بڑی مان مرادیں کی جارہی تھیں۔

آخر وہ دن بھی آ ہی گیا جب ایشور نے جانکی کی گود میں پھول سا بیٹا دے دیا۔ پنڈت رام نارائن بہت خوش تھے۔ بیٹا پا کر انھوں نے جیسے سب کچھ پالیا تھا۔ جب اولاد دیر سے ہوتی ہے تو اس کا لاڈ پیار بھی بہت ہوتا ہے۔ پنڈت رام نارائن نے بیٹے کے لاڈ پیار میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ بیٹا دیکھنے میں ماں باپ ہی کی طرح سندر تھا۔ اس لئے رام نارائن نے اس کا نام روپ نارائن رکھا تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ روپ نارائن کا روپ بھی کھلتا گیا۔ جب وہ سولہ سال کا ہوا تو گاؤں کی کئی لڑکیاں اُس پر جان چھڑکنے لگیں۔ روپ کا من پوجا پاٹھ میں بالکل نہیں لگتا تھا۔ وہ دن بھر یار دوستوں کے ساتھ کھیل کود میں مگن رہتا۔ کبھی کبھی جب رام نارائن اسے پوجا پاٹھ کے لیے کہتے تو وہ بہانا کر اِدھر اُدھر چلا جاتا۔ رام نارائن کو یہ لگنے لگا کہ ان کے گھر میں ناستک پیدا

ہوگیا ہے۔ وہ سوچتے اور من مسوس کر رہ جاتے کہ یہ بھی ایشور کی مرضی ہے۔

ایک دن شیو جی کے مندر میں روپ نے سانپ دیکھا اور اسے فوراً مار ڈالا۔ رام نارائن کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے اسے بہت ڈانٹا۔ کہا:

''ناگ دیوتا کو مارنا پاپ ہے، وہ شیو جی کے گلے میں رہتے ہیں۔''

لیکن روپ نارائن جیسا ناستک بھلا یہ سب کہاں ماننے والا تھا۔ اسے اپنے پتا رام نارائن کی باتوں پر ہنسی آنے لگی۔

کچھ دن ہوئے آدھی رات کا وقت تھا، روپ نارائن پلنگ پر گہری نیند میں سو رہا تھا اُسے ایسا لگا جیسے اس کے گلے میں کچھ بھاری گیلی سی چیز رینگ رہی ہے۔ اچانک اس نے اپنے ہاتھ سے اسے جھٹک کر دور پھینک دیا۔ نیند ٹوٹی تو اس نے دیکھا کہ ایک بڑا سا سانپ کچھ دیر پہلے اس کے گلے میں تھا۔ اس نے فوراً سانپ کو مار دیا۔ اس بار بھی رام نارائن اور جانکی دونوں ہی نے روپ نارائن کو بہت سمجھایا کہ ناگ دیوتا کو مارنا نہیں چاہئے تھا، لیکن روپ نارائن نے یہ کہہ کر اپنے ماں باپ کو خاموش کر دیا کہ اگر وہ مجھے کاٹ لیتا اور میں مر گیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ ظاہر ہے ہزاروں منتوں کے بعد اولاد کا منہ دیکھنے والے ماں باپ اسے کھونے کے خیال ہی سے تھرا کر رہ گئے۔

یہ عجیب بات تھی کہ اس دن کے بعد سے روپ نارائن کو اکثر سانپ دکھائی دیتے اور وہ ان کو مارے بنا چین نہیں لیتا تھا۔ اگر سانپ بھاگ کر اِدھر اُدھر چھپ جاتا یا کسی بل میں گھس جاتا تب بھی روپ نارائن اسے جب تک باہر نکال کر مار نہیں دیتا تب تک اسے چین نہیں ملتا تھا۔ سانپ دیکھتے ہی وہ بے چین ہو جاتا، اس میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آجاتی کہ سانپ کتنا ہی زہریلا کیوں نہ ہو وہ بنا مارے دم نہیں لیتا۔ سارے گاؤں میں روپ نارائن سانپ مارنے والا مشہور ہو گیا تھا۔ کہیں بھی کسی کے گھر یا کھیت میں سانپ دکھائی دیتا تو لوگ روپ نارائن کو بلا کر لے جاتے اور پھر وہ بڑے جتن سے سانپ کو مار کر اپنے گھر واپس آتا۔ اب یہ روپ نارائن کی عادت بن گئی تھی۔ سانپ مار کر اسے ویسی ہی خوشی ملتی تھی جیسی اپنے دشمن کو مار کر لوگوں کو ملتی ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ ایشور نے اسے پیدا ہی اسی لیے کیا ہے کہ دھرتی پر جنم لینے والے تمام زہریلے سانپوں کو مار کر ان کے زہر سے دنیا والوں کو وہ مکتی دلا دے۔ رام نارائن اور جانکی دیوی نے بھی اب اسے سانپ مارنے کے بارے میں روکنا بند کر دیا تھا کیوں کہ وہ ان کی سنتا ہی نہیں تھا۔

دو چار دن مشکل سے بیتتے تھے جب روپ نارائن کو سانپ نہیں دکھائی دیتا تھا اور وہ اسے مار نہیں دیتا تھا۔ اب تک وہ سینکڑوں سانپوں کو مار چکا تھا لیکن کسی سانپ نے اسے کبھی کاٹا

نہیں تھا۔ ایک دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ رات کے اندھیرے میں روپ نارائن گاؤں کی پگڈنڈی سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی طرف جارہا تھا کہ اس کے پاؤں کے نیچے ایک چھوٹا سا زہریلا سانپ آ گیا۔ اس کی منڈی روپ کے جوتے کے نیچے تھی اور پونچھ سے اس نے روپ کی پنڈلی کو جکڑ لیا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے سانپ نے اسے کاٹ لیا ہے، اس نے چاہا کہ وہ سانپ کو فوراً مار دے لیکن کسی کی بات اسے یاد آ گئی کہ اگر سانپ کاٹ لے تو اسے مارنا نہیں چاہئے ورنہ کاٹے ہوئے انسان کو لہر نہیں آتی اور اس کا زہر نہیں اترتا اور وہ مر جاتا ہے۔ موت کے ڈر سے وہ کانپ گیا اور اس نے خود کو بچانے کے لیے سانپ کو مارے بنا زندہ ہی چھوڑ دیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی سانپ کو زندہ چھوڑا تھا۔ سانپ اپنے راستے چلا گیا لیکن روپ نارائن اپنا پاؤں پکڑ کر وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اسے ایسا لگنے لگا جیسے اب وہ مر جائے گا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ کب، کہاں اور کیسے کیسے اس نے سانپوں کو مارا تھا وہ سب کچھ اسے یاد آنے لگا۔ زندگی میں اسے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ اسے موت سے بچانے والا ایک ہی ایشور ہے۔ اسی کی شرن میں جا کر وہ اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ وہ زندگی بھر ناستک رہا تھا، لیکن یہ ایک لمحہ ایسا آیا جو اسے آستک بنا گیا۔ اس کی آتما پر ماتما میں لین ہو گئی۔ اسے ایسا لگنے لگا جیسے ایشور اس کے سامنے موجود ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے اور باتیں کر رہا ہے۔ نہ جانے کب تک وہ اسی طرح کھویا رہا۔ آج سے اس نے خود کو کھو کر ایشور کو پالیا تھا، یہ احساس اسے زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ یہ ایسا احساس تھا جسے بیان کرنا مشکل تھا۔ جو کچھ اس نے محسوس کیا تھا وہ سب اس کی اپنی ذات تک محدود تھا۔ اس نے ایشور سے کہا:

''ہے ایشور اب میری زندگی صرف تیرے ہاتھ ہے، میں نے کبھی تیرے آستھو کو نہیں مانا لیکن آج اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ دھرتی اور آکاش کا بنانے والا تو ہے، تو ہی زندگی دینے والا ہے، مجھے بھی زندگی دے دے۔ مجھے میرے پاپوں سے مکت کر دے۔ اور آج یہ سوگندھ لیتا ہوں کہ آج کے بعد کبھی کسی سانپ کو نہیں ماروں گا۔''

اپنی ساری شکتی سمیٹ کر وہ وہاں سے چلتا ہوا شیو جی کے مندر آیا جہاں اس کے پتا جی پجاری تھے۔ مندر میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اس نے شیو جی کو بڑی شردھا سے نمن کیا اور وہاں سے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اب تک اس کی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی۔ لیکن رات میں وہ رات بھر نہیں سویا نہ ہی سانپ کے کاٹنے کے بارے میں اس نے اپنے ماں باپ کو بتایا۔

صبح جب رام نارائن جلدی اٹھ کر شیو جی کے مندر میں پوجا کرنے کے لیے کھڑے

ہوئے تو انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کے ساتھ ایک نیا پجاری اور کھڑا ہے، وہ کوئی اور نہیں ان کا اپنا بیٹا روپ نارائن ہے۔ آج ان کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔

اس دن کے بعد روپ نارائن کو سانپ دکھنا بند ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ ہر دو چار دن میں جو سانپ اسے نظر آتے تھے وہ اب کیوں دکھائی نہیں دیتے؟ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ گاؤں کے لوگ جو روپ نارائن کو سانپ مارنے والا کہا کرتے تھے اب اس کی پوجا پاٹھ دیکھ کر اسے پنڈت روپ نارائن کہنے لگے تھے۔ ایک ناستک پوری طرح پنڈت بن گیا تھا جس کی آتما پر ماتما سے مل گئی تھی۔

☆☆

رفیق شاہین

تجزیہ — سانپ

ابراہیم اشکؔ آسمان ادب پر مہر نصف النہار کی طرح تاباں و درخشاں ایک ایسا مستند و معتبر نام ہے جس سے ادب کی متعدد جہات اور بہت سے رنگ منسوب ہیں۔ موصوف بیک وقت محقق، نقاد، شاعر اور اختراع کار و افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے کئی افسانے جہاں ہماری ہم عصر زندگی کے آئینہ دار ہیں وہیں وہ ہمارے فکر و احساس کو مہمیز کر کے نہ صرف ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہیں بلکہ ہمارے جذبات کو برانگیختہ کر کے اور ہمیں اپنا ہم مزاج و ہم خیال بنا کر افسانہ نگار کے مشاہدات و تجربات پر ہم سے مہرِ تصدیق بھی ثبت کرا لیتے ہیں۔ ان کے بیان کی سچائی، فکری برنائی، جذبے کی رعنائی، اسلوب کی زیبائی اور لفظ و زبان کی سچائی سے مرتب و آراستہ افسانے ہمارے دل کی دھڑکنوں میں نشاط و انبساط اور کیف و سرور کے موسیقی ریز نغمے گھول کر ہمارے مذاقِ جمالیات کو کماحقہ آسودگی بھی فراہم کرتے ہیں۔

اشکؔ نے اپنے معاشرے، اپنے ماحول اور اطراف و اکناف میں سوالیہ نشان بنے سنگین مسائل سے جوجھتی ہوئی پُر آشوب زندگی کی زبوں حالیوں، محرومیوں، مایوسیوں، سفاکیوں اور المناکیوں کو موضوع بنا کر انہیں بڑے ہنرمندانہ کمال اور فنی چابکدستی کے ساتھ افسانے کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں کا پس منظر، ماحول، منظر اور کردار چونکہ نامانوس نہیں ہوتے بلکہ ہمارے دیکھے بھالے اور جانے پہچانے سے ہوتے ہیں اس لئے ان کے افسانوں پر فرضی سرگزشت کے بجائے حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

اشکؔ کی کہانی ''سانپ'' جداگانہ موضوع پر ایک بانکی، انوکھی اور اچھوتی سی کہانی ہے جو خدا کی عظمت و فضیلت، اہمیت و ضرورت اور اس کی افادیت کو منطقی استدلال کے ساتھ ثابت کرنے کی ایک کامیاب کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔

کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ پنڈت رام نارائن شاستری جو پکّے مذہبی انسان اور مندر کے

پجاری بھی ہیں۔ ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا روپ نارائن بے جالاڈ پیار میں بگڑ کر نہ صرف والدین کی نافرمانی کرتا ہے بلکہ وہ دیوی دیوتاؤں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور نہ خدا سے ڈرتا ہے، یہاں تک کہ وہ باپ کے منع کرنے کے باوجود بھی سانپوں کو ہلاک کرنے سے باز نہیں آتا ہے۔ مندر جیسے مقدس استھان پر بھی بے خوف وخطر سانپ کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ سانپ شکار کرنا اس کا دلچسپ مشغلہ بن جاتا ہے اور وہ ساری بستی میں سانپ مارنے والے کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے۔

اگر چہ وہ خدا یا بھگوان کے خلاف زبان سے تو کچھ نہیں کہتا لیکن اس کی بھگوان سے بے زاری اور دیوی دیوتاؤں کی بے حرمتی خود بخود اس بات کا ثبوت بن جاتی ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں ایک ناستک اور دہریہ (Atheist) ہے۔ آگے چل کر یہ ہوتا ہے کہ کھیتوں کی درمیانی پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے ایک سانپ اس کے جوتے کے نیچے آجاتا ہے۔ اور قبل اس کے کہ روپ نارائن اسے مارنے کا خیال دل میں لائے اس پر یہ یقین غالب آجاتا ہے کہ سانپ اُسے ڈس چکا ہے۔ وہ سانپ کو ہلاک کئے بغیر ہی گھر چلا آتا ہے اور بنا کسی کو بتائے بستر پر پڑا ساری رات بھگوان سے اپنی زندگی کی بھیک مانگتا رہتا ہے۔ پھر علی الصبح پجاری جی جب مندر میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں ایک اور پجاری کو موجود پا کر سخت حیرت میں پڑ جاتے ہیں کیونکہ وہ پجاری ان کا اپنا بیٹا روپ نارائن ہی تھا۔

یہ کہانی تضادات کا ایک دلکش نمونہ ہے جو دو متخالف جہات کی نشاندہی کرتی ہے۔ باپ بھگوان میں گہری آستھا رکھتا ہے جبکہ بیٹا اس سے ذرا بھی خائف نہیں۔ باپ دیوی دیوتاؤں کا آدر سمان کرتا ہے لیکن بیٹا نرادر اور ایمان کرتا ہے۔ باپ شیو جی کے گلے میں پڑے ناگ دیوتا کے حوالے سے سانپ کو مارنا پاپ سمجھتا ہے جبکہ سانپوں کو مارنا بیٹے کا دلچسپ مشغلہ ہے اور وہ بھگوان کے گھر میں (مندر میں) بھی سانپ کو مار کر مندر کو اپوتر کرنے سے نہیں چوکتا ہے۔ اس کے والدین اس کے بے جا ناز اٹھاتے ہیں اور وہ اس کے برعکس ان کی نافرمانی کرتا ہے۔ باپ پکا مذہبی انسان ہے مگر بیٹا مذہب بیزار دہریہ اور ایک ناستک ہے۔

فی الواقعہ ابراہیم اشک کی کہانی ''سانپ'' Contradictions یا Paradoxicals کی بنیاد پر ایستادہ ایک ایسی انوکھی کہانی ہے جو مغربی مفکرین اور فلسفہ داں کانٹ (Kant) اور ڈیکارٹے (Descartes) کے نظریاتی تضادات کا طواف کرتی ہوئی یک تمثیلی ڈرامے کی شکل میں اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

طرف سے روپیوں کی بارش ہونے لگے گی۔'

دوسرے نے کہا 'تیر صحیح نشانے پر لگ گیا ہے۔ ماحول کو گرمائے رکھنے ہی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔ اس ماحول کو کسی قیمت پر ٹھنڈا مت ہونے دینا۔'

ابھی ماحول گرم ہی تھا کہ لوک سبھا کے چناؤ آ گئے۔

ایک نکتا مسلمانوں کے علاقے سے بھاری اکثریت سے جیت گیا۔ دوسرا نکتا ہندوؤں کے علاقے سے جیتا اور منتری بن گیا۔ رشوت کا بازار گرم ہو گیا، گھوٹالوں کا موسم آ گیا۔ دیش کنگال اور بدحال ہونے لگا اور دونوں نکتے مالا مال ہو رہے تھے۔ ابھی انھوں نے دھندے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا۔ ابھی تو انھیں کئی منزلیں طے کرنی تھیں۔ ملک اور قوم کو پتن کی گہری کھائی میں اترنا تھا۔

ایک نکتے نے مندر بنانے کی تیاری کرنے کے لیے چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے نے مسجد کی تعمیر کے لیے مہم چلا دی۔ لاکھوں کروڑوں روپئے اکٹھا ہونے لگے۔ مندر کا نقشہ تیار کیا گیا، پتھر گڑھے جانے لگے، مسجد کے لیے بھی خاص طرز کی اینٹیں بننے لگیں جن پر 'اللہ' لکھا ہوا تھا۔ دونوں نکتے بڑی شان سے رہنے لگے۔ سرکار نے ان کی حفاظت کا خاص انتظام کر رکھا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتے ان کے آگے پیچھے کمانڈوز کا گھیرا ہوتا۔ وہ آزادرہ کر بھی قید تھے۔

وہ دن بھی آیا جب مندر بنانے کے لیے ہزاروں ہندو آگے بڑھے اور مسجد بنانے کے لیے مسلمانوں نے مورچہ سنبھالا۔ گھمسان جنگ ہونے لگی۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح اخباروں اور ٹی وی چینلوں کے ذریعہ سارے دیش میں پھیل گئی۔

گاؤں جلنے لگے، شہر جلنے لگے، ہزاروں بے گناہ لوگ مرنے لگے، عورتوں کی بے عزتی ہونے لگی، بچوں کو آگ میں جھونکا جانے لگا۔ دیش ودیش کے اخباروں میں دل دہلانے والی خبریں اور تصویریں چھپنے لگیں۔ دونوں نکتوں کے ٹی وی چینلوں پر انٹرویو آنے لگے۔ تباہی اور بربادی کا ایک نیا اتہاس لکھا جانے لگا۔ دیش کی سرکار اتھل پتھل ہونے لگی۔ ساری دنیا فکرمند تھی۔ دنگوں سے متاثر لوگوں کے لیے کروڑوں روپے کی امداد آنے لگی۔ دونوں نکتے چندے کے لیے ودیش یاترا پر نکلے ہوئے تھے۔ ہر کوئی دکھی تھا لیکن وہ دونوں خوش تھے۔ بہت خوش تھے کیوں کہ ان کا دھندہ انٹرنیشنل پیمانے پر خوب پھل پھول رہا تھا۔

☆☆

کانٹ (Kant) خدا کے بارے میں اس حد تک منفی تاثرات وتصورات رکھتا ہے کہ خدا کا مضحکہ اڑانے سے نہیں چوکتا وہ کہتا ہے۔ ''خدا کو جنم دینے والے خدا کے خالق تو ہم خود ہیں۔ اگر ہم اسے ماننے سے انکار کر دیں تو کہاں ٹکے گا؟ کہاں جائے گا خدا؟ اگر ہم تصور کر لیں کہ ہمارے ہاتھ میں سونے کا بسکٹ ہے تو کیا آپ اس کے بدلے میں ہمیں کرنسی دینے کے لئے راضی ہو جائیں گے؟'' اس کے برعکس ڈیکارٹے (Descartes) کا نظریہ وجود الٰہیہ کے اثبات کا منطقیانہ اظہار ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ خدا کی تسلیم نہ کرنے سے تو زندگی ہی بدمزہ و بے رنگ اور بے معنی و بے مقصد ہو کر رہ جائے گی لہٰذا خدا کے تصور کو بجائے Perception کے Conception تک ہی محدود رکھنا چاہئے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی خدا کو، گاڈ کو، بھگوان کو عظیم ترین قوت وطاقت کے طور پر ہر ملک، ہر قوم اور ہر قبیلے میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ غفلت میں پڑ کر انسان خدا بیزار ہو بھی سکتا ہے لیکن جب وہ کسی مصیبت کے جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور کوئی تدبیر کام میں نہیں آتی اس وقت اسے خدا کے آگے سرنگوں ہونا ہی پڑتا ہے۔

اگر بغور دیکھا جائے تو یہ سچ بات ماننے میں کسی کو بھی عذر نہ ہوگا کہ سانپ کے ڈسنے سے پہلے تک کہانی کے مرکزی کردار روپ نارائن پر کانٹ (Kant) کا فلسفہ یا نظریہ پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔ وہ کانٹ کے نظریات کو عملی جامہ پہناتے واضح طور پر نظر آتا ہے۔ روپ نارائن نے خدا کو، بھگوان کو دیکھا نہیں ہے وہ اس کے دائرہ احساس (Perception) سے باہر ہے، آنکھیں اسے دیکھنے سے عاجز ہیں اس لئے وہ اس کے وجود کو عقل کا فتور یا واہمہ مان کر اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ دیوی دیوتاؤں کو بے حس و بے جان پتھر مان کر اور ان کے سامنے ہی سانپ کو مار کر ان کا اپمان کرتا ہے۔ سانپ کے خون سے مندر کو اپوتر کرنے میں اسے کوئی تردد نہیں ہوتا۔ وہ مندر کو بت خانے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ یہ ساری سرگرمیاں اور اس کے یہ سارے عمل ہمیں کانٹ کے نظریات کی توثیق کرتے نظر آتے ہیں۔

لیکن جب کھیتوں کی درمیانی پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے اسے سانپ کا سانحہ پیش آجاتا ہے تو یہاں کانٹ (Kant) کا سارا فلسفہ شکستہ اور ریزہ ریزہ ہو کر روپ نارائن کو اپنی آسیبی گرفت سے آزاد کر دیتا ہے۔ اب موت یقینی نظر آنے پر روپ نارائن کو خود بھی یقین کامل ہو جاتا ہے کہ دہریت (Atheism) کا راستہ ہلاکت کا راستہ ہے اور اب اسے موت سے Supreme Power ہی بچا سکتی ہے۔ بس یہی وہ مقام ہے جہاں اپنے مثبت نظریے کے حوالے سے ڈیکارٹے (Descartes) آگے بڑھ کر روپ نارائن کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور روپ نارائن اپنے فکر وعمل میں ڈیکارٹے کا

ترجمان بن کر سامنے آتا ہے اور تصورِ الٰہی یعنی God Conception پر ہی اکتفا کر لیتا ہے اور بہ رغبت و رضا خدا کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے۔

یہ بڑی خوبی کی بات ہے کہ ابراہیم اشک نے محیر العقول واقعات و کرشمات اور مذہبی معجزات کا سہارا لئے بغیر ہی کہانی کو معنی و مقصد سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے سانپ کے ڈسنے کے سانحے کو حقیقت سے ماورا بطور واہمہ شعار کیا ہے جس سے کہانی کار کو مذہبی نوعیت کے کسی معجزے کا سہارا بھی نہ لینا پڑا اور کہانی کے ہیرو کی خود کار طور پر جان بھی بچ گئی۔ نیز خدا کی عظمت و اہمیت کے حوالے سے اشک جو بات کہنا چاہتے تھے اس کی ترسیل بھی بخوبی انجام پا گئی۔

ابراہیم اشک لفظیات کے معاملے میں کنجوسی کی حد تک کیفیات شعار واقع ہوئے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ایک بھی فاضل لفظ کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ زبان و بیان کے استعمال میں ان کی سادگی و شائستگی کا جواب نہیں ہے۔ وہ کہانی کو جلد از جلد اس کی آخری منزل تک پہنچانے کی دھن میں راستے میں واقعات بیان کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے ہیں اور ان کا رسمی سا ذکر کر کے جلدی سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور اس طرح واقعات کی موجوں پر ڈولتی ڈگمگاتی ہوئی ان کی کہانی کی نیا خود بخود کنارے لگ جاتی ہے۔ ان کی کہانی ''سانپ'' سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ کہانی پن، پلاٹ، منظر اور کرداروں کی مدد سے ترتیب دیا ان کا یہ افسانہ ہر طرح کی ژولیدگی و پیچیدگی اور ابہامیت و مہملیت سے پاک ایک سیدھا سچا افسانہ ہے جو افسانہ نگار کے پیغام کی ترسیل کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنے اختتام پر گہرا اور دیرپا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔

Taleem Manzil, Marris Road
Aligarh- 202002

☆☆

قمر الدین فلک

تجزیہ — سانپ

علم وادب کی دنیا میں ایسے حضرات شاذ ونادر ہی پیدا ہوتے ہیں جو بیک وقت کئی سمتوں میں پُر وقار انداز میں معیاری سفر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ جس صنف سخن کو بھی چھوتے ہیں جاوداں بنا دیتے ہیں۔ ہماری نئی نسل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں ابراہیم اشک جیسا شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور سچا اور بیباک تنقید نگار پیدا ہوا ہے۔

ویسے تو ابراہیم اشک کے تمام افسانے دل کے قریب سے ہو کر گزرتے ہیں لیکن ایک افسانہ ''سانپ'' میرے دل ہی کو نہیں میری زندگی کو چھو گیا۔ دراصل یہ افسانہ میری اپنی نفسیات سے اس قدر جڑا ہوا ہے کہ یہ ابراہیم اشک کے قلم سے نکلی ہوئی میری ہی آواز معلوم ہوتی ہے کیونکہ میں بچپن ہی سے سانپوں میں پلا بڑھا ہوں اور ان کی نفسیات سے بخوبی واقف بھی ہوں۔ میرا آبائی وطن برہانپور (ایم۔ پی) ہے۔ وہاں کے قرب وجوار میں مجھے ایک سپیرے کے طور پر آج بھی جانا جاتا ہے۔ لوگ مجھے اس وقت شدت سے یاد کرنے لگتے ہیں جب کسی کے گھر آنگن میں سانپ نکلتا ہے۔ اس وقت میری حیثیت خدا کے ذریعہ بھیجے گئے ایک مددگار کی سی ہوتی ہے۔ مجھے وہ لوگ بھی بُلاتے ہیں جو کسی قسم کا اندھ بسواس نہیں رکھتے اور وہ بھی بلاتے ہیں جو سانپ کی پوجا کرتے ہیں کیونکہ میں سانپوں کا دشمن نہیں دوست ہوں۔ اسی لئے بڑی فکر سے اس جگہ پہنچ جایا کرتا ہوں جہاں سانپ نکلا ہو۔ میں سانپ کو پکڑ کر دور جنگل میں چھوڑ دیا کرتا ہوں۔ میرا دیر سے پہنچنا دو باتیں پیدا کر دیتا ہے۔ پہلی تو یہ ہے کہ میرے جانے سے پہلے ہی سانپ ہمیشہ کا خوف چھوڑ کر خود چلا جائے اور دوسری بات یہ کہ کچھ لوگ مل کر اس سانپ کو مار نہ ڈالیں۔

ابراہیم اشک کا افسانہ ''سانپ'' پڑھنے کے بعد مجھ پر جو تاثر قایم ہوا اسے مختصر طور پر شعری زبان میں بیان کیا جائے تو وہ اس طرح ہوگا ؎

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے

ابراہیم اشک نے افسانے کو جس خوبصورت موڑ پر چھوڑا ہے اس سے ان کی افسانہ نگاری کی خلاقی صاف طور پر ابھر کر آئی ہے۔ ویسے تو میں پہلے ہی سے ان کے شعری مجموعے ''الہام'' ''آگہی'' ''الاؤ'' اور ''محفوظ مجھے کرلو'' پڑھ کر ان کی شاعرانہ سوچ سے متاثر ہو چکا ہوں لیکن پہلی بار ان کے افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے اور اسی اتفاق نے مجھے ان کے نثری آہنگ کے طلسم سے آشنا کر دیا ہے جس کا سحر ہر سطر کے بعد دوبالا ہوتا چلا جاتا ہے۔

ابراہیم اشک کے افسانوں میں کردار سازی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ ان کے کردار زندہ جاوید ہیں۔ کرداروں کے ساتھ ساتھ ماحول بھی پڑھنے والوں کے ذہن میں اپنی تصویر بناتا رہتا ہے۔ ''سانپ'' میں انہوں نے نارائن اور روپ نرائن کا انتخاب کر کے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ صرف انسانی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے کردار تراشتے ہیں بلکہ ان کرداروں کو دیئے جانے والے نام بھی کردار کی صفات بیان کرتے ہیں۔ مثلاً روپ نرائن کے پتا کا نام انہوں نے نارائن رکھا اور افسانے میں نارائن بھولے شنکر کی طرح اپنے حصے کا کردار نبھاتا ہے۔ جب اس کے یہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے بیٹے کو بھی اپنی ہی طرح بنانے کی امید میں اس کا نام روپ نرائن رکھتا ہے لیکن روپ نرائن شروعاتی ایام میں روپ نرائن نہ تو بھولے شنکر کی طرح ہوتا ہے، نہ ہی اپنے پتا کی طرح بلکہ اس کی مثال تو ایسی ہوتی ہے جیسے ''آنکھ کے اندھے نام نین سنکھ۔'' کیونکہ ایک مرتبہ جب ایک سانپ اس کے جسم کو چھو کر اس کے آرام میں خلل پیدا کرتا ہے بس اُسی دن سے روپ نرائن سانپوں کا دشمن بن جاتا ہے اور یہی چیز اسے پورے گاؤں میں مشہور کر دیتی ہے۔ کہیں بھی سانپ نکلنے پر روپ نرائن کو لوگ یاد کرنے لگتے ہیں، لیکن روپ نرائن کی اس مقبولیت سے اس کے پتا نارائن خوش نہیں ہیں۔ اس نے ناراض ہو کر اپنے ناستک بیٹے کو ایشور کے بھروسے پر چھوڑ دیا ہے۔ دن گزرتے رہتے ہیں اور روپ نرائن اپنے کام میں مصروف رہتا ہے۔ اس کے بعد ابراہیم اشک نے بڑی ہی خوبصورتی سے اپنے افسانے کو وہ نفسیاتی موڑ دیا ہے جہاں ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا میں وہ کونسا لمحہ ہوگا جب انسان نے بھگوان کو پیدا کیا تھا یعنی ایک ایسا خوف جس کے ذریعہ سے انسان انسانیت کے قوانین پر عمل کرتا رہے۔

روپ نرائن جب رات کے اندھیرے میں پگڈنڈی پر چلتا ہوا ایک سانپ پر انجانے میں پاؤں رکھ دیتا ہے اور وہ زہریلا سانپ روپ نرائن کو ڈس لیتا ہے تب روپ نرائن کو یاد آتا ہے کہ ڈسنے والا سانپ اگر مر جائے تو جس انسان کو اس نے ڈسا ہے وہ بھی مر جاتا ہے۔ یہ بات عقیدت میں ناقابل یقین ہے، لیکن اس بات کو منوانے کے لئے ابراہیم اشک نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے

ہوئے، اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے افسانے کا پس منظر چھوٹا سا گاؤں کر دیا ہے جہاں کے لوگ آج بھی امریکہ اور لندن کی تجربہ گاہوں سے آنے والی معلومات سے واقف نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس علم ہی کو سچا علم مانتے ہیں جو اُن کے بزرگوں سے سینہ بہ سینہ چلتا ہوا ان کی نسل تک پہنچا ہے۔

اسی لئے روپ نرائن کو جب سانپ ڈس لیتا ہے تو اسے وہی بات یاد آتی ہے جو اس کے باپ دادا نے اسے کہی تھی۔ اور پھر بھگوان پر بسواس نہ کرنے والا روپ نرائن یہ بھی بسواس کر لیتا ہے کہ سانپ شنکر کے گلے کا ہار ہے اور اب وہ ہی اس کی مدد کر سکتا ہے اسلئے روپ نرائن ہاتھ جوڑ کر بھگوان شنکر سے اپنے کئے کی معافی مانگتا ہے اور قسم کھاتا ہے کہ اگر وہ بچ گیا تو کبھی سانپوں کو نہیں مارے گا کیونکہ اب اسے بھی احساس ہو گیا ہے کہ زندگی کس قدر خوبصورت ہوتی ہے اور موت کس قدر ڈراؤنی۔ اور اس کے ہاتھوں نہ جانے کتنے خوابوں کے ٹوٹنے بکھرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

اس افسانے میں کہیں نہ کہیں ابراہیم اشک یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان چاہے جتنی کوشش کر لے ہدایت دینا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی لئے نارائن کے لاکھ منع کرنے پر بھی روپ نرائن نے سانپوں کو مارنا نہیں چھوڑا لیکن خدا نے ہی اسے ہدایت دینے کے لئے وہ ماحول تیار کیا کہ روپ نرائن جیسا ناستک نوجوان بھی آستک بن گیا اور پھر جس امید سے نرائن نے اپنے بیٹے کا نام روپ نرائن رکھا تھا وہ امید بر آئی۔ وہ نرائن یعنی ایشور کا روپ بن گیا۔

اس افسانے میں روپ نرائن کے ناستک سے آستک بننے کی وجہ چاہے سائنسی نقطۂ نظر سے ٹھیک نہ ہو لیکن کردار اور ماحول کے حساب سے قابلِ قبول ضرور ہے کیونکہ ادب میں سورج اور چاند ڈوبتے اور نکلتے ہیں جبکہ حقیقت میں نہ تو سورج اور چاند ڈوبتے اور نکلتے ہیں بلکہ سائنسی اعتبار سے ان کی رفتار کا عالم کچھ اور ہی ہے۔

آخر میں ارسطو نے جو ادب کی تعریف میں کہا ہے اس کسوٹی پر میں ابراہیم اشک کو کھرا پاتا ہوں وہ یہ ہے کہ ''جو کچھ بھی دنیا میں موجود ہے وہ عالم بالا کی نقل ہے اور تمام ادب اُسی نقل کی نقل ہے۔'' ارسطو کی اسی تعریف کو بیشتر ادیب ابراہیم اشک ہی کی طرح برتتے آرہے ہیں مثلاً ساحر لدھیانوی کے یہ دو شعر

آئینۂ حوادثِ ہستی ہیں میرے شعر — جو دیکھتا رہا ہوں سو لکھتا رہا ہوں میں
تاروں کی انجمن سے مجھے واسطہ نہیں — انسانیت پہ اشک بہاتا رہا ہوں میں

B- 902, Mukesh Aparts, Gillbirt Hill,
Near Bhawan's Gollege, Andheri (W) 400058

☆☆

ملاپ

نصیر خاں دو سو بیگھا زمین کے مالک تھے۔ بیس بیلوں کی جوڑیاں، پچیس تیس گائیں اور بھینسیں۔ دودھ گھی کی اُن کے گھر میں ندیاں بہتی تھیں۔ نصیر خاں بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ گاؤں کے پٹیل اور سرپنچ بھی وہی تھے۔ شام ہوتے ہی ان کی بیٹھک دربار میں بدل جاتی تھی۔ گاؤں کے لوگ اپنی سمسیائیں لے کر ان کے پاس آتے۔ نصیر خاں سب کی بات بڑے دھیان سے سنتے اور پھر ایسا حل نکالتے کہ لوگ دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ جاتے۔ ان کی نظر میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں تھا۔ سب برابر تھے۔ وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ گاؤں کے غریبوں کا وہ خاص خیال رکھتے تھے۔ ضرورت مند اُن کے یہاں سے دودھ، دہی، گھی اور اناج مفت میں لے جاتے تھے۔

گائیوں، بھینسوں، بیلوں اور زمین جائداد کی دیکھ بھال کے لیے ان کے یہاں کئی نوکر تھے۔ جو صبح سے شام تک اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ نصیر خاں ہر ایک سے مسکرا کر بات کرتے۔ کوئی غلطی بھی کرتا تو باتوں باتوں میں اس طرح سے سمجھاتے کہ آدمی اپنی غلطی پر خود شرمندہ ہو جاتا اور دوسری بار غلطی نہ کرنے کی قسم کھا لیتا۔

شادی کے بعد شروع میں نصیر خاں کے یہاں چار لڑکیاں ہوئیں۔ جن میں سے تین جنم لینے کے تین چار دنوں میں ہی مر گئیں۔ چوتھی لڑکی بڑی مان مرادوں کے بعد بچی۔ جس کا نام انہوں نے فاطمہ رکھا تھا۔ فاطمہ کے بعد ایک لڑکا ہوا۔ جس کا نام نصیر خان نے رئیس خان رکھا۔ رئیس خان کو پڑھا لکھا کر نصیر خان تھانیدار بنانا چاہتے تھے، لیکن ماں باپ کے لاڈ پیار میں وہ مڈل پاس کرنے کے بعد آگے نہ پڑھ سکا۔ فاطمہ پڑھنے میں بہت تیز تھی۔ ہائر سیکنڈری کی پریکشا اس نے اوّل درجے میں پاس کی تھی۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن نصیر خان نے اپنی برادری کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے ایم اے پاس لڑکے ریاض خان سے اس کی شادی کر دی۔ فاطمہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش حال اور کامیاب زندگی گزار رہی تھی۔

اپنے چھوٹے بھائی رئیس خان سے فاطمہ بہت محبت کرتی تھی۔ سسرال کے قریبی رشتے داروں میں عائشہ پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی تھی۔ فاطمہ سے اس کی خوب بنتی تھی۔ عائشہ کو اس نے اپنے بھائی رئیس خان کے لیے پسند کر لیا تھا۔ بات نصیر خان تک پہنچی اور فاطمہ کے کہنے پر رئیس خان کا رشتہ لے کر وہ فوراً عائشہ کے گھر جا پہنچے۔ عائشہ کے والد پرائمری اسکول میں ٹیچر تھے۔ بیٹی کا رشتہ دولت مند گھر سے آیا تھا۔ لڑکا بھی خوبصورت تھا۔ بیڑی، سگریٹ، پان تک کی کوئی لت نہیں تھی۔ بیٹی اس گھر میں جا کر راج کرنے والی تھی۔ اس لیے انکار کی کوئی وجہ نہ تھی۔ رشتہ طے ہو گیا۔ شادی کی تاریخ پکی ہو گئی۔

نصیر خان نے اپنے اکلوتے بیٹے رئیس خان کی شادی بڑی دھوم سے کی تھی۔ قوالی، مشاعرہ اور مجرے کے شاندار پروگرام آٹھ دنوں تک گاؤں میں ہوتے رہے۔ رئیس خان کی شادی کیا تھی گاؤں میں سبھیتا اور سنسکرتی کا میلہ لگا ہوا تھا۔ شادی کی ایسی دھوم لوگوں نے کبھی دیکھی نہیں تھی۔ نصیر خان پیسہ پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی میں وہ اپنے سارے ارمان پورے کر لینا چاہتے تھے۔ اس فرض سے نبٹنے کے بعد ان کے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ سعودی عرب جا کر حج ادا کریں۔

رئیس خان کی بارات میں گاؤں کی پچاس سے بھی زیادہ بیل گاڑیاں شامل تھیں۔ وہ قافلہ جدھر سے گزرتا لوگ کھڑے ہو کر دیکھتے رہ جاتے۔ ان کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ لوگ دولہے کو دیکھتے تو ان کے منہ سے نکل جاتا ''واہ کیا بانکا اور سجیلا جوان ہے۔'' فاطمہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ڈھولک بجا کر جھوم جھوم کے شادیانے گا رہی تھی۔ خدا نے اسے آواز بھی سریلی دی تھی۔ وہ کسی چہکتی ہوئی بلبل سے کم نہیں تھی۔ گاڑیوں کا یہ قافلہ جنگل سے گزرتا تو جنگل آباد ہو جاتا۔ شہر سے گزرتا تو شہر کی گلیوں میں رونق آ جاتی۔

بارات جب لڑکی والے کے یہاں پہنچی تو محلے کے آس پاس کی گلیوں میں ہر طرف بیل گاڑیاں نظر آنے لگیں۔ عائشہ کی سہیلیاں دیکھ دیکھ کر حیران تھیں۔ کوئی کہتی ''بڑے بھاگ والی ہے جو اتنے بڑے زمیندار کے یہاں بیاہ کر جا رہی ہے۔'' دوسری ٹہوکا دیتی ''راتوں رات سینکڑوں بیگھا زمین کی مالک بن جائے گی عائشہ۔ ایشور لڑکی کا بھاگیہ دے تو ایسا ہی دے تب ہی زندگی کا مزہ ہے ورنہ عورت ذات کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔'' تیسری بولی ''وہ کہتے ہیں نہ، رانی بیٹی راج کرے گی یہ شادی اسی کی مثال ہے بہن۔''

نکاح پڑھانے کے لیے خاص طور سے شہرِ قاضی کو بلایا گیا تھا۔ مہر باندھنے کی جب

بات آئی تو نصیر خان کہنے لگے جو کچھ میرے بیٹے کا ہے وہ سب بہو کا بھی ہے۔ آپ جو چاہیں نکاح نامے پر لکھ دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ قاضی صاحب کہنے لگے'' وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن مہر کی ایک رقم طے ہونا چاہئے اور یہ رقم مرد کی حیثیت کے مطابق عورت کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے جسے وہ ادا کر سکے۔''

آخر کار پانچ لاکھ روپئے مہر کی رقم طے پائی جو دولہے کی حیثیت کے مطابق تھی۔ دولہا دلہن نے نکاح قبول کیا۔ قاضی صاحب نے آیتیں پڑھ کر نئے جوڑے کی کامیاب زندگی کے لیے دعائیں مانگیں اور پھر محفل میں چھوہارے، سنگھاڑے اور مصری اُڑائی گئی۔ لوگوں میں منہ میٹھا کرنے کے لیے موتی چور کے بڑے لڈو بانٹے گئے۔ دلہن کے گھر بارات آنے سے لے کر بدائی اور دولہے کے گھر بارات پہنچنے تک فاطمہ نے اپنی دلہن بھابھی کو اس طرح سنبھالا جیسے کوئی کانچ کی گڑیا کو سنبھالتا ہے۔ عائشہ تھی بھی بہت نازک آبگینے کی طرح ذرا سی ٹھیس لگنے سے ہی بکھر جانے والی۔ ماں باپ کی وہ لاڈلی بیٹی تھی۔ انھوں نے اسے بڑے نازوں سے پالا تھا۔

رئیس خان عائشہ کو پا کر بہت خوش تھے۔ عائشہ نے جلد ہی پورے گھر کو سنبھال لیا تھا۔ اس سے اس کی ساس کو کافی راحت مل گئی تھی۔ عائشہ کے آنے سے پہلے تک وہی نوکر چاکر کا پورا خیال رکھتی تھی۔ جب تک فاطمہ کی شادی نہیں ہوئی تھی اپنی ماں کے کام میں وہ ہاتھ بٹایا کرتی تھی اس کی شادی کے بعد سارے کام کی دیکھ بھال کا بوجھ پھر رئیس خان کی ماں پر آ گیا تھا، لیکن عائشہ نے آتے ہی اپنی ساس کو آرام سے پلنگ پر بٹھا دیا تھا۔ اب انھیں ایسا لگنے لگا تھا جیسے عائشہ کے روپ میں انھیں اپنی بیٹی فاطمہ واپس مل گئی ہے۔

نصیر خاں اپنی بیوی کو ساتھ لے کر حج کے لیے جا رہے تھے۔ اس لیے گاؤں کے ہر آدمی سے گھر جا جا کر مل رہے تھے۔ شہر جا کر وہ اپنی بیٹی فاطمہ اور داماد سے بھی ملے۔ اپنی بہو عائشہ کے والد والدہ سے بھی مل کر آئے۔ جانے سے پہلے ساس سسر نے عائشہ کو پاس بٹھا کر تمام کھیتی باڑی اور گھر کے کام کاج کے بارے میں سمجھایا اور ساری ذمہ داریاں واپس آنے تک اسے سونپ دیں۔ رئیس خان اپنے یار دوستوں میں مگن رہتا تھا اس لیے ماں باپ کو اس سے زیادہ عائشہ پر بھروسہ تھا۔

عائشہ صبح جلد اٹھ جاتی تھی۔ نہا کر وہ نماز پڑھتی اور پھر نوکروں سے گائیوں اور بھینسوں کا دودھ نکلواتی۔ بیلوں کی جوڑیاں ہالیوں کے ساتھ کھیتوں کے لیے روانہ کرواتی۔ گھر سے سب جانور چلے جاتے تو گوبر گھورے پر پھینکواتی اور صاف صفائی کرواتی۔ گوبر پھینکنے اور صفائی کا کام کرنے کے لیے صبح پانچ ساڑھے پانچ بجے بجنی آ جاتی تھی۔ بجنی ذات کی چمار تھی۔ نصیر خاں کے

وہاں وہ بچپن سے اپنے ماں باپ کے ساتھ کام کرنے آتی تھی۔ اب وہ جوان ہوگئی تھی۔ باپ بیمار رہنے لگا تھا اور ماں سے بھی اب گوبر کی تگاریاں نہیں اٹھتی تھیں۔ بجنی نے سارا کام سنبھال لیا تھا اور مالکن کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ بجنی الہڑ موج میں بہتی ندی کی طرح تھی۔ اس کا انگ انگ جوانی کے مد میں ڈوبا تھرکتا اور مچلتا رہتا تھا۔ دیکھنے والے کی نظر اس پر ٹھہرتی نہیں تھی۔ بھٹک کر رہ جاتی تھی۔ گاؤں کے کئی جوان لڑکے اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ لیکن کسی کو بھی اس نے اپنے چھپے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیا تھا۔ چمارٹولی کا ایک گونگا لڑکا بھی اسے آتے جاتے پریشان کرتا رہتا تھا۔ جسے وہ کئی بار چپل دکھا چکی تھی۔ گونگا اس کی چپل کھانے کو بھی تیار تھا۔

وہ رات قیامت کی رات تھی ساری رات زور زور سے بادل گرجتے رہے تھے اور بجلیاں چمکتی رہی تھیں۔ بارش ایسی تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ عائشہ ساری رات رئیس خان کے گلے میں بانہہ ڈالے سوئی رہی۔ نیند دونوں کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ صبح ہونے کو آئی تھی اچانک عائشہ کو ایک جھپکی آئی اور وہ گہری نیند میں سوگئی۔ صبح کی اذان کب ہوگئی اسے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ اچانک اس کی نیند کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ رئیس خان پتہ نہیں کب بستر سے اٹھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا اکثر ایسا ہوتا تھا۔ وہ جب واپس آتا تو عائشہ کے پوچھنے پر بتاتا کہ کسرت کرنے گیا تھا۔ کسرت کے لیے گائے بھینسوں کے باڑے کے پاس ہی اس نے اپنا ایک کمرہ بنا رکھا تھا۔ جہاں رئیس خان کے علاوہ کوئی اور آتا جاتا نہیں تھا۔ عائشہ کو شرارت سوجھی ذرا جا کر دیکھے تو سہی رئیس خان کس طرح کسرت کرتا ہے۔ وہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی رئیس خان کے کمرے کی طرف چل دی۔ دروازہ تھوڑا سا اٹکا ہوا تھا۔ اس نے دھیرے سے دروازے کو دھکا دیا تو کمرے کا منظر دیکھ کر اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ رئیس خان اور بجنی دو جسم ایک جان ہوئے پڑے تھے۔ اور ان کی عجیب وغریب کسرت جاری تھی۔ عائشہ کا سارا وجود تلملا کر رہ گیا۔ وہ بہت کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن اس کے سارے الفاظ ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ اس پر سکتے کا عالم تھا۔ رئیس خان اور بجنی دونوں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور دونوں ہی گنہگاروں کی طرح عائشہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عائشہ کی نظریں بجنی سے کئی سوالات پوچھ رہی تھیں۔ بجنی ہاتھ جوڑ کر اس سے کہنے لگی

''میرا کوئی قصور نہیں ہے مالکن۔ سب کچھ مالک کی مرضی سے ہوا ہے۔ میں نے بہت سمجھایا آپ شادی شدہ ہیں آپ کی پتنی اپسرا جیسی ہے لیکن یہ نہیں مانے۔ ہم غریبن کے کیچڑ میں کود پڑے۔ ہمارا کوئی قصور نہیں ہے مالکن۔''

بجنی ہاتھ جوڑ کر روئے جا رہی تھی اس کی دونوں آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی تھیں۔

عائشہ نے اسے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ رئیس خان کی طرف اس نے حقارت بھری ایک نظر ڈالی اور جدھر سے آئی تھی ادھر ہی الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ ہر قدم پر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زمین میں زلزلہ آیا ہوا ہے۔ وہ دھنس رہی ہے اور عائشہ بس ابھی اس میں سما جانے والی ہے۔ اس نے کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی زندگی میں کبھی ایسی بھیانک گھٹنا بھی ہو سکتی ہے۔ جس کا چشم دید گواہ اسے خود بننا پڑے گا۔

اپنے بیڈ روم میں جب عائشہ آئی تو ڈبل بیڈ پر اسے رئیس خان کے ساتھ اپنی جگہ پر میلے کچیلے کپڑوں والی گوبر سے لت پت بجنی سوئی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ خوبصورت مخملی چادر پر اسے گوبر پڑا ہوا دکھائی دینے لگا اور اس کی سڑاند اس کے ناک سے دماغ تک پہنچنے لگی۔ اسے لگا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا۔ سامنے طاق میں قرآن شریف رکھا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے اٹھایا۔ سینے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نہ جانے کب تک یونہی وہ روتی رہی۔

رئیس خان ہمت کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے آیا لیکن عائشہ نے اسے بری طرح پھٹکار دیا۔ ''میں نے زندگی میں پہلی بار جس شخص کو ٹوٹ کر چاہا وہ تم تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہاری پسند ایک گوبر اٹھانے والی نیچ عورت ہے۔ تم میرے لائق نہیں ہو۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی ہے جب میری زمین میں تم نے اپنا بیج بو دیا ہے۔ میں اس بیج کو سینچوں گی ضرور لیکن اس پر تمہارا گھناؤنا سایہ کبھی نہیں پڑنے دوں گی۔ میں جا رہی ہوں اور اب پلٹ کر واپس کبھی نہیں آؤں گی۔'' عائشہ چلی گئی تھی۔ رئیس خان کسی بھی جتن سے اسے روک نہیں پایا تھا۔ گنہگاروں سے زندگی کا کوئی بھی طوفان نہیں رکتا ہے۔

بجنی ماں بننے والی تھی۔ سارے گاؤں والے جان گئے تھے کہ اس کے پیٹ میں رئیس خان کا پاپ پل رہا ہے۔ بجنی کے ماں باپ بہت پریشان تھے۔ نصیر خان ہوتے تو ان سے انصاف مانگتے، لیکن وہ تو حج کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ بجنی کافی بدنام ہو گئی تھی کوئی اس سے شادی کرنے کے لیے راضی نہیں تھا۔ رئیس خان کو معلوم تھا کہ چمار ٹولی کا گونگا لڑکا بجنی کو دل و جان سے چاہتا ہے اور اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ رئیس خان نے گاؤں کے کچھ بزرگ لوگوں کو بیچ میں ڈال کر بجنی کی شادی گونگا سے کرا دی۔ بجنی کی قسمت میں گنگوا ہی لکھا تھا جس سے وہ سخت نفرت کرتی تھی اور جسے کئی بار وہ چپل دکھا چکی تھی۔ آج اسی کے قدموں میں سمٹ سکڑ کر اسے بیٹھنا پڑا تھا۔

نصیر خاں اور ان کی بیوی حج کر کے جب واپس گھر آئے تو ان کی اکلوتی لاڈلی بہو عائشہ ان کے استقبال کے لیے موجود نہیں تھی۔ انہوں نے بار بار رئیس خان سے اس کا سبب پوچھا،

پروفیسر خالد حسین خاں

تجزیہ — دھندہ

مذہبی منافرت، ہندو مسلم مغائرت، فرقہ وارانہ فسادات اور ملک و معاشرے کے جذباتی، جنونی اور خونی انسان نما درندوں پر محیط، بہت سے افسانہ نگاروں نے چھ دہوں میں لاتعداد کہانیاں لکھی ہیں، اس موضوع کی جانب قلمکاروں کا دھیان، گیان اور رُجحان ہندوستان کے بٹوارے کے معاً بعد، ہوا۔

دراصل، سقوط ہند، برصغیر کا سب سے مہیب و منحوس، تاریخی المیہ تھا، جس کے اثرات نے دیگر قلمکاروں کے باوصف، حساس فکشن نگاروں کے دل و دماغ میں سب سے زیادہ ہیجان و ہلچل پیدا کئے تھے۔ صدہا افسانے اور ناول، تقسیم وطن کے پس منظر میں لکھے گئے جن میں انسانی محرومی اور حرماں کا عمق بھی ہے، تباہی کی حیرت ناکی بھی، محبت کا معجزہ بھی، درندگی و بربریت کی ہولناکی بھی، غداری کا احساسِ جُرم بھی اور باہمی نفرت و تعصّب کا الاؤ بھی!

بٹوارے کے نتیجہ میں مذہبی منافرت، کشت وخون کی سیاست کا گھناؤنا اور گمبھیر ننگا ناچ جس تیزی و تندی سے شروع ہوا اس کے سبب ہندو پاک کی سرحدوں کے دونوں جانب لاکھوں لوگوں نے آگ کے دریا کو عبور کر کے ہجرت کی اور دورانِ مہاجرت لامتناہی بے گناہ اور معصوم لوگ کیڑے مکوڑوں کی مانند مسلے گئے اور گاجر مولی کی طرح کاٹے گئے۔ مذکورہ پسِ منظر کے حوالے سے تمام افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں میں اس لاعلاج مرض کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے اور اس کا مداوا تلاش کرنے کی حسبِ توفیق و توانائی، بھرپور کاوش و کاہش کی ہے۔ ابراہیم اشک نے بھی اسی موضوع اور اسی تھیم پر اپنی زیرِ تجزیہ کہانی ''دھندہ'' پیش کی ہے۔

اس کہانی کے صرف دو مرکزی کردار ہیں جو بغیر ناموں کے نکتے کردار ہیں اور ان کی سوچ و اپروچ، ان کی فطانت و فطرت اور حرکات و سکنات سے قاری کو ابتداء سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے اکثریتی اور اقلیتی طبقوں سے وابستہ، دو مختلف مذاہب کے پیروکار

لیکن کوئی صحیح جواب انھیں نہیں مل پایا۔ نصیر خان نے دوسرے ہی دن اپنے ایک خاص آدمی کو عائشہ کو لانے کے لیے بھیجا۔ عائشہ کو نہیں آنا تھا وہ نہیں آئی۔ نصیر خان اپنی بیوی کے ساتھ خود گئے اور عائشہ کو منا کر لانا چاہا، لیکن اس نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ نصیر خاین بھی خالی ہاتھ واپس لوٹ آئے۔ رئیس خان کو اس کی گھٹیا حرکت کے سبب انھوں نے خوب پھٹکارا وہ گردن نیچی کیے سنتا رہا۔

بجنی ماں بن گئی تھی۔ اس نے ایک خوبصورت لڑکے کو جنم دیا۔ بجنی سانولی تھی لیکن لڑکا رئیس خان کی طرح گورا تھا۔ نین نقش بھی ہو بہو رئیس خان کے پائے تھے۔ پہلے چمارٹولی میں یہ چرچا عام ہوئی کہ بجنی نے رئیس خان کی اولاد کو جنم دیا ہے۔ پھر گاؤں کے ہر گھر میں اس پر بحث ہونے لگی۔ رئیس خان کے یار دوست اسے چھیڑنے لگے۔ ''میاں تمہارا ہم شکل آ گیا ہے بجنی کی گود میں۔'' یہ بات نصیر خان تک بھی پہنچ گئی۔ رئیس خان کی ماں بھی جان گئی اور پھر اڑتے اڑتے ایک دن یہ خبر عائشہ تک بھی پہنچ گئی۔ اس کے دل میں رئیس خان کے لیے جو نفرت تھی اس میں اور اضافہ ہو گیا۔

بجنی کے ماں بننے کے کچھ دنوں بعد ہی عائشہ بھی ماں بنی تھی۔ اس نے بھی لڑکے کو جنم دیا تھا، لیکن یہ لڑکا عائشہ کی صورت شکل کا تھا۔ رئیس خان کی ذرا سی بھی پرچھائیں اس پر نہیں پڑی تھی۔ عائشہ نے اپنا چہرہ مہرہ اسے دے دیا تھا۔ بیٹا پا کر اس نے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنی گزر بسر کرے گی اور بیٹے کی پرورش کرے گی۔

نصیر خان کو بیٹے کا گھر اجڑ جانے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ انہوں نے ہیرے جیسی لڑکی رئیس خان کے لیے چنی تھی لیکن وہ ہیرے کی قدر نہیں کر پایا۔ پتھر سے اس نے اپنے نصیب پھوڑ لیے۔ عائشہ کو رئیس خان سے ایسی نفرت ہو گئی تھی کہ وہ اس کی صورت دیکھنے تک کو تیار نہیں تھی۔ ساتھ رہنا تو بہت دور کی بات ہے۔ رئیس خان نے ماں باپ کے چپکے سے عائشہ کو طلاق کے کاغذات بھیجے تا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کر کے دوسری شادی کر سکے۔ عائشہ نے کاغذات بغیر دستخط کیے ہی واپس لوٹا دیئے اور یہ خبر پہنچا دی کہ وہ آزادی سے دوسری شادی کر سکتا ہے۔ جہاں تک طلاق کی بات ہے جب رشتہ ٹوٹ ہی چکا ہے تو کاغذی کارروائی کی ضرورت کیا ہے۔ یہ سب بے مطلب ہے۔ اس کے بعد رئیس خان نے برادری کی ایک طلاق شدہ لڑکی سے نکاح پڑھ کر دوبارہ گھر بسا لیا تھا۔ یہ عائشہ ہی کا جگر تھا کہ اس نے رئیس خان کی زمینداری اور دھن دولت کو ٹھوکر مار دی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی مہر کے پانچ لاکھ روپے بھی معاف کر دیئے تھے۔

بجنی نے اپنے لڑکے کا نام موہن رکھا تھا۔ جو بھی اس لڑکے کو دیکھتا وہ اسی کا من موہ لیتا تھا۔ چمارٹولی میں کچھ لوگ بجنی کو چڑھانے کے لیے لڑکے کو چھوٹے نواب بھی کہتے تھے۔ ان کا اشارہ رئیس خان کی طرف ہوتا تھا۔ بجنی اس کا کوئی بُرا نہیں مانتی تھی بلکہ موہن کو جب کوئی چھوٹے نواب کہتا تو اس کے دل کی کلی کلی کھل جاتی۔ رئیس خان کو وہ اب بھی دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ رئیس خان بھی اسے بھول نہیں پایا تھا۔ جنسی طور پر جو سکھ بجنی نے اسے دیا تھا وہ اسے عائشہ جیسی پڑھی لکھی لڑکی سے نہیں مل پایا تھا۔ اس معاملے میں بجنی عائشہ سے میلوں آگے تھی۔ شاید یہ اس لیے بھی تھا کہ بجنی اور رئیس خان نے ایک دوسرے سے عشق کیا تھا جب کہ عائشہ اور رئیس خان تو سماجی بندھن کی وجہ سے ایک ہوئے تھے۔ رئیس خان اور بجنی نے تو تمام سماجی بندھنوں سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے سچے عشق کو ساکار کیا تھا۔ جس کا ثبوت موہن تھا۔ بجنی نے اپنے محبوب کی چھبی ہو بہو اپنی تخلیق میں اتار دی تھی۔ ویسے ہی جیسے کوئی مصور کسی کو اپنے سامنے بیٹھا کر اس کی ہو بہو تصویر بنا دیتا ہے۔ یہ کمال تو وہی کر سکتا ہے جو عشق کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ بجنی نے پریم کی اس چرم سیما کو پالیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے موہن جوان ہو گیا۔ اس کا قد، کاٹھی، چال، ڈھال، روپ، سوروپ بالکل رئیس خان کے جیسا تھا۔ موہن کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا باپ گاؤں کا زمیندار رئیس خان ہے۔ نصیر خان اور ان کی بیوی کی موت کے بعد رئیس خان نے بجنی کو پھر اپنے یہاں کام پر رکھ لیا تھا۔ دونوں کے تعلقات پھر ہموار ہو گئے تھے۔ رئیس خان کی دوسری بیوی کو سب کچھ معلوم تھا، لیکن اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ عائشہ کی طرح بے وقوف نہیں تھی کہ اتنی ذرا سی بات کے لیے اتنی بڑی زمینداری اور دھن دولت کو ٹھوکر مار کر در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرے۔ وہ یہ سوچ کر چپ رہ جاتی تھی کہ ایک سے زیادہ عورتوں سے تعلقات رکھنا رئیس زادوں کی پہچان ہے۔ وہ دن میں کہیں بھی جائے رات میں تو اپنی اصل بیوی کے بستر کو گرم کرتا ہی ہے۔ اس کے گھر کی رانی تو اصل بیوی ہی ہوتی ہے۔ رکھیلیں لاکھ کوشش کریں مالکن تھوڑے ہی بن سکتی ہیں۔

موہن اپنے باپ رئیس خان کی طرح سماجی حیثیت حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن نہ تو وہ اپنی ماں بجنی کو چھوڑ سکتا تھا نہ چمارٹولی کو اور حقیقت یہ تھی کہ ان سے پیچھا چھڑائے بغیر سماجی حیثیت حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ موہن کا دل بھٹکتا رہتا تھا۔ وہ کبھی مدرسے میں جا کر مولوی صاحب سے قرآن پڑھنے لگتا، کبھی مسجد میں جا کر نماز پڑھتا، رمضان کا مہینہ آتا تو پورے مہینے کے روزے رکھتا، عید کے دن نئے کپڑے پہنتا، عطر لگاتا، یار دوستوں سے عید کی خوشی میں گلے ملتا۔ بجنی اسے کبھی منع

نہیں کرتی بلکہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔ رئیس خان کو بھی جب بھی ان باتوں کے بارے میں معلوم ہوتا تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ سوچتا آخر خون کس کا ہے۔ یہ سب تو اسے کرنا ہی ہے۔

شہر میں ہوم گارڈ کی بھرتی چالو تھی۔ موہن کو معلوم ہوا تو اس نے بھی نام لکھوا دیا۔ انٹرویو کے بعد اسے چن لیا گیا۔ آج وہ ہوم گارڈ کی وردی پہنے بہت خوبصورت لگ رہا تھا نصیر خان زندہ ہوتے تو موہن کو اس وردی میں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ رئیس خان کو وہ تھانیدار بنانا چاہتے تھے لیکن رئیس خان نے ان کا خواب پورا نہیں کیا تھا، لیکن رئیس خان کی ناجائز اولاد اس قابل تو بن گئی تھی کہ اس کے بدن پر خاکی وردی سجی تھی۔

موہن جلد سے جلد شہر سے گھر جانا چاہتا تھا۔ وہ بجنی کو دکھانا چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں بھی اب دیش کا قانون ہے اور وہ اس قانون کے تحت مجرم کو پکڑ سکتا ہے۔ اسے سزا دلا سکتا ہے۔ وہ اب کسی پر ظلم نہیں ہونے دے گا۔ ابھی وہ آدھے راستے میں تھا کہ گاؤں کی طرف سے شہر جانے کے لیے رئیس خان بھی نکلے۔ موہن شہر سے گاؤں کی طرف آ رہا تھا اور رئیس خان گاؤں سے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں دونوں پگڈنڈی پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ رئیس خان موہن کو وردی میں دیکھ کر سر سے پاؤں تک خوشی سے شرابور ہو گئے۔ ان کا جی چاہا وہ اسے سینے سے لگا کر دعائیں دیں کیونکہ وہی تو ان کی محبت کی سچی یادگار تھا۔ ان کے عشق کا سچا ثبوت تھا۔ انہوں نے موہن کی طرف اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ موہن چمبک کی طرح کھنچتا ہوا رئیس خان کی بانہوں میں آ کر سما گیا۔ برسوں کی دوریاں قربتوں میں بدل گئیں۔ زمین و آسمان باپ اور بیٹے کا یہ ملاپ دیکھ کر جھومنے لگے۔ گاؤں کی پگڈنڈی پر جیسے سورگ اتر آیا تھا۔ تمام حوریں اور فرشتے ان پر پھول برسا رہے تھے۔

☆☆

ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد

تجزیہ — ملاپ

افسانہ "ملاپ" کے مطالعے نے شدت کے ساتھ یہ احساس دلایا کہ بنیادی طور پر شاعری سے ذوق رکھنے والے ابراہیم اشک کو کہانی کہنے کے ہنر پر گرفت ہے اور اس افسانے میں ان کا ہنر اس مقام پر ہے کہ مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ اس افسانے کی پیشکش میں انہوں نے ہم عصر ایک نہیں کئی افسانہ نگاروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ افسانہ ملاپ کا پلاٹ انتہائی جامع، مضبوط اور مستحکم ہے۔ نصیر الدین خان، ان کی دوسو بیگھہ زمین کی زمینداری، بیلوں کی جوڑیاں، گائیں، بھینسیں، نوکر چاکر، تین لڑکیوں کی ولادت وانتقال، ایک لڑکی فاطمہ کی ناز برداری سے پرورش، پھر ایک لڑکے رئیس خان کی ولادت، شان وشوکت سے لڑکے کی پرورش وپرداخت، عالیشان طریقے سے رئیس خان کی شادی خانہ آبادی۔ پانچ لاکھ روپے بطور مہر کی بخوشی قبولیت، بہو کی حیثیت سے عائشہ کے حسن وسیرت کی تعریف وتوصیف، سسرال والوں کے دلوں میں بہو عائشہ کے لئے ڈھیر ساری محبت، عائشہ کے دل میں سسرال والوں کے لئے ڈھیر ساری عزت وتوقیر، عائشہ کا بہو کی حیثیت سے انتہائی سلیقے سے ذمہ داریوں کا سنبھالنا۔ گھر کی تمام ذمہ داریاں بہو عائشہ کو سونپ کر نصیر الدین خاں اور ان کی اہلیہ کا سفر حج پر روانہ ہونا۔ خوشحال ماحول میں معمولات زندگی کا بسر ہونا۔ ایک رات رئیس خان کو نوکرانی بجنی کے ساتھ دیکھ کر عائشہ کے پیروں تلے سے زمین کا کھسکنا۔ عائشہ کا چراغپا ہونا، غصہ میں سسرال کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہنا، نصیر الدین خان اور ان کی اہلیہ کی واپسی، بہو کو سسرال میں موجود نہ دیکھ کر ان کی حیرانی، بیٹے کے گھر کے اجڑنے کا غم، بجنی کا امید سے ہونا، سماج میں عزت کے قائم رکھنے کی خاطر گنگوا سے اس کی شادی، اس کے بطن سے رئیس خان کی شکل وصورت لئے بچے موہن کی پیدائش، میکے میں عائشہ کو بھی ولادت، رئیس خان سے بالکل الگ ومختلف شکل وصورت والے بچے کی پیدائش، دیکھتے ہی دیکھتے بجنی اور رئیس خان کے ملاپ کا نتیجہ موہن کا جوان ہونا، رئیس خان کی دوسری شادی، دوسری بیوی کو

رئیس خان اور بجنی کے ناجائز رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، موہن کا رئیس خان کے مذہب کی جانب جھکاؤ، ہوم گارڈ میں اس کی بھرتی، رئیس خان کا موہن کے لئے بانہیں پھیلانا، موہن کا رئیس خاں کی بانہوں میں سما جانا۔ یہ تمام واقعات ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ و پیوستہ ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک بھی واقعہ کو حذف یا ادھر سے ادھر نہیں کیا جاسکتا اور یہی ابراہیم اشک کی کامیاب پلاٹ سازی ہے، پہچان ہے۔ افسانہ ملاپ میں واقعی ابراہیم اشک نے کامیاب پلاٹ سازی کا نمونہ پیش کیا ہے۔

افسانہ "ملاپ" کی کردار نگاری کی پیشکش میں بھی ابراہیم اشک نے کامیاب کردار سازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ نصیر خان، رئیس خان، عائشہ، بجنی، موہن، فاطمہ ان تمام کرداروں کو ابراہیم اشک نے محض زندگی نہیں بلکہ ان کی زندگیوں میں سانسیں بھی عطا کردی ہیں۔

ابراہیم اشک کہانی کہنے کے ہنر پر اتنی مضبوط گرفت رکھتے ہیں کہ افسانے کے آغاز سے آخر تک قارئین کے ذہن کو افسانے کی کہانویت میں محصور کردیتے ہیں۔ افسانہ ملاپ کے آغاز کے جذب و کشش کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے کیا جاسکتا ہے:

> "آخر کار پانچ لاکھ روپے مہر کی رقم طے پائی جو دولہے کی حیثیت کے مطابق تھی۔ دولہا دلہن نے نکاح قبول کیا۔ قاضی صاحب نے آیتیں پڑھ کر نئے جوڑے کی کامیاب زندگی کے لئے دعائیں مانگیں اور پھر محفل میں چھوہارے سنگھاڑے اور مصری اڑائی گئی۔ لوگوں میں منہ میٹھا کرنے کے لئے موتی چور کے بڑے لڈو بانٹے گئے۔ دلہن کے گھر بارات آنے سے لے کر بدائی اور دولہے کے گھر بارات پہنچنے تک فاطمہ نے اپنی دلہن بھابھی کو اس طرح سنبھالا جیسے کوئی کانچ کی گڑیا کو سنبھالتا ہو۔ عائشہ تھی بھی بہت نازک، آبگینے کی طرح ذرا سی ٹھیس لگنے سے ہی بکھر جانے والی۔ ماں باپ کی وہ لاڈلی بیٹی تھی۔ انہوں نے اسے بڑے نازوں سے پالا تھا۔"

افسانے کا انداز بیان اس قدر عام فہم اور روزمرہ کے استعمال سے پُر ہے کہ قارئین کو یہ احساس ہوتا ہے واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے رونما ہو رہا ہے۔ قیامت کی رات کا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے:

> "وہ رات قیامت کی رات تھی۔ ساری رات زور زور سے بادل گرجتے رہے تھے اور بجلیاں چمکتی رہی تھیں۔ بارش ایسی تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے

رہی تھی۔ عائشہ ساری رات رئیس خان کے گلے میں بانہیں ڈالے سوئی رہی۔ نیند دونوں کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ صبح ہونے کو آئی تھی اچانک عائشہ کو ایک جھپکی آئی اور وہ گہری نیند میں سوگئی۔ صبح کی اذان کب ہوگئی اسے کچھ پتہ ہی نہیں چلا اچانک اس کی نیند کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ رئیس خان پتہ نہیں کب بستر سے اٹھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا اکثر ایسا ہوتا تھا وہ جب واپس آتا تو عائشہ کے پوچھنے پر بتاتا کہ کسرت کرنے گیا تھا۔ کسرت کے لئے گائے بھینسوں کے باڑے کے پاس ہی اس نے اپنا ایک کمرہ بنا رکھا تھا۔ جہاں رئیس خاں کے علاوہ کوئی اور آتا جاتا نہیں تھا۔ عائشہ کو شرارت سوجھی ذرا جا کر دیکھے تو سہی رئیس خان کس طرح کسرت کرتا ہے۔ وہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی رئیس خان کے کمرے کی طرف چل دی۔ دروازہ تھوڑا سا اٹکا ہوا تھا۔ اس نے دھیرے سے دروازے کو دھکا دیا تو کمرے کا منظر دیکھ کر اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ رئیس خان اور بجنی دو جسم ایک جان ہوئے پڑے تھے اور ان کی عجیب وغریب کسرت جاری تھی۔ عائشہ کا وجود تلملا کر رہ گیا وہ بہت کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن اس کے سارے الفاظ ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ اس پر سکتے کا عالم تھا رئیس خان اور بجنی دونوں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور دونوں ہی گنہگاروں کی طرح عائشہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عائشہ کی نظریں بجنی سے کئی سوالات پوچھ رہی تھیں۔ بجنی ہاتھ جوڑ کر اس سے کہنے لگی میرا قصور نہیں ہے مالکن، سب کچھ مالک کی مرضی سے ہوا ہے۔ میں نے بہت سمجھایا آپ شادی شدہ ہیں آپ کی پتنی اپسرا جیسی ہے لیکن یہ نہیں مانے ہم غریبن کے کیچڑ میں کود پڑے ہمارا کوئی قصور نہیں ہے مالکن۔''

ابراہیم اشک کے انداز پیشکش کے اس منفرد انداز سے قارئین نہ صرف پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ ان کی دلچسپی کہانی کے آغاز سے انتہا تک برقرار رہتی ہے۔ افسانہ ملاپ نہ صرف فن افسانہ نگاری کی کسوٹی پر ایک مکمل، ٹھوس اور جامع افسانہ ہے بلکہ اس افسانے میں منشی پریم چند کے افسانوں کی روح یعنی کہانویت پوری طرح سرایت نظر آتی ہے۔ اور صرف کہانی ہی نہیں بلکہ کہانی کا منظر وماحول بھی ہمیں منشی پریم چند کے افسانوں کی یاد دلاتا ہے۔ ابراہیم اشک نے انتہائی فنکاری اور ہنرمندی سے نہ صرف زمیندارانہ ذہنیت کی تصویر کشی کی ہے

بلکہ اُنتہائی خوبی سے اس ذہنیت پر طنز کے تیر بھی برسائے ہیں۔ گھر میں سب کچھ میسر ہونے کے باوجود اِدھر اُدھر منہ مارنے پر فخر محسوس کرنے والی ذہنیت پر ابراہیم اشک کا افسانہ ملاپ ایک ایسا طمانچہ ہے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتا لیکن قارئین اپنے ذہن و دل پر اس کی جھنجھناہٹ محسوس کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر ابراہیم اشک کا افسانہ ''ملاپ'' موجودہ افسانوی ادب میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔

Head Deptt. of Urdu, Mahadeo Singh College
Bhagalpur (Bihar)812002

☆☆

بخشش

شرفو کو صاحب علی کی خدمت کرتے ہوئے پانچ برس ہونے کو آئے تھے۔ ان پانچ برسوں میں شرفو نے صاحب علی کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ صبح چار بجے اٹھ جاتا تھا۔ اُٹھ کر سب سے پہلے صاحب علی کا پیک دان صاف کرتا جس میں پان کی پیک اور بلغم بھرا ہوتا تھا۔ ایسا کرتے وقت اسے کبھی گھن نہیں آئی کیونکہ صاحب علی کو اس نے ہمیشہ اپنے بزرگ رشتہ دار سے بھی کہیں زیادہ اہمیت دے رکھی تھی۔ وہ اُنھیں دل سے چاہتا تھا۔ پیک دان صاف کرنے کے بعد وہ نہاتا اور مصلہ بچھا کر فجر کی نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ نماز پڑھ کر وہ اپنے لیے چائے بناتا اور چائے کے ساتھ رات کی باسی روٹی سے ناشتہ کرتا۔ صاحب علی رات کو دیر تک شراب پیتے اور جاگتے رہتے۔ اس لیے صبح دیر تک سوتے رہتے تھے۔

شرفو کا پورا نام شرافت علی تھا۔ اس کے باپ دادا سیّد تھے اور رام پور نواب کے یہاں دربار میں اونچے عہدوں پر رہ چکے تھے۔ شرافت کے والد کا انتقال جلدی ہو جانے سے اس کی تعلیم و تربیت ٹھیک سے نہیں ہو پائی تھی۔ ماں نے محنت مزدوری کر کے اسے پالا پوسا تھا اور جلد ہی اپنے خاندان کی ایک غریب لڑکی سے اس کی شادی بھی کر دی تھی۔ پلک جھپکتے وہ چار بچوں کا باپ بن گیا تھا۔ ماں کے انتقال کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ دربار میں ملازمت کے سہارے اپنی زندگی وہ جیسے تیسے گزار رہا تھا۔ چاروں لڑکیاں جوان ہوتی جا رہی تھیں۔ بیوی سمجھدار تھی۔ چار کی جگہ ایک روپیہ خرچ کرتی اور تین روپئے بچا کر رکھ لیتی تھی۔ شرفو کے پوچھنے پر حساب ایسا بتاتی کہ اسے یقین ہو جاتا کہ اب اس کے پاس کچھ نہیں بچا ہے۔

لڑکیاں جوان ہوئیں تو شرفو کی بیوی نے غریب گھر کے شریف لڑکوں کے ساتھ ان کی شادیاں بھی جلدی جلدی کر دیں۔ چاروں لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے بعد تمام عمر تنگ دستی اور دکھ بھری زندگی سے جدوجہد کرنے والی شرفو کی بیوی نکھ کی گہری نیند سونا چاہتی تھی۔ چوتھی بیٹی کی

ڈولی جب گھر سے اٹھی تو شرفو کی بیوی نے اپنی بیٹی کو ہنسی خوشی کے ساتھ وداع کیا۔ اس دن اس کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں چھلکا۔ برات وداع کرنے کے بعد اس نے اپنے شوہر شرفو سے کہا تھا۔ ''اتنے دن سے گھر میں شادی کا جھمیلا تھا اس لیے رتجگے ہی ہوتے رہے ہیں۔ ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی۔ بہت تھک گئی ہوں۔ آج جی بھر کر سونا چاہتی ہوں۔ تمہیں تو صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے، لیکن خدا کے لیے مجھے جلدی مت اٹھانا۔ میں دیر تک سونا چاہتی ہوں۔''

اس دن شرفو ہمیشہ کی طرح فجر کی اذان کے وقت اُٹھ گیا۔ خود چولہا جلا کر چائے بنائی۔ نہایا، نماز پڑھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور پھر قرآن شریف پڑھنے بیٹھ گیا۔ آج وہ قرآن کی آیتوں کے ساتھ ساتھ اُن کا اُردو میں ترجمہ بھی پڑھ رہا تھا۔ کچھ اس کی سمجھ میں آتا اور کچھ نہیں بھی آتا لیکن جتنا بھی آتا تھا اس کا اثر اس کے دل پر گہرا ہو رہا تھا۔ پاس ہی اس کی بیوی گہری نیند میں سو رہی تھی۔ اس کا دل بار بار چاہ رہا تھا کہ بیوی کو اٹھا کر وہ قرآن شریف کا ترجمہ سمجھائے لیکن پھر اسے یاد آجاتا کہ رات کو اس نے کہا تھا کہ جلدی مت اٹھانا۔ میں دیر تک سونا چاہتی ہوں اور وہ اس کو جگانے سے اپنے آپ کو روک لیتا۔

آنگن میں دھوپ چھٹک آئی تھی۔ قرآن شریف اٹھا کر شرفو نے طاق میں رکھا اور سوچا اب تو بہت دیر ہوگئی ہے۔ بیوی کو اٹھایا جائے آخر کب تک سوتی رہے گی۔ وہ پاس گیا۔ دیکھا اس کے چہرے پر دوپٹہ پڑا ہوا ہے۔ اس نے دھیرے سے دوپٹہ ہٹایا اور آواز لگائی۔ ''شبانہ کی ماں، اُٹھو کب تک سوتی رہوگی؟''

لیکن شبانہ کی ماں نے پلٹ کر کوئی جواب نہیں دیا۔ شرفو نے سوچا ایسا تو کبھی نہیں ہوا ہے۔ لاکھ وہ کتنی ہی گہری نیند میں کیوں نہ ہو آواز سن کر تو وہ ''ہاں'' ''ہوں'' کرتی ہی ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بدن کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی تو اسے عجیب سا احساس ہوا۔ بدن کچھ کچھ اکڑا ہوا تھا۔ اس کا دل ''دھک'' سے رہ گیا۔ ماں کی موت اس نے دیکھی تھی اس لیے سب کچھ ایک ہی لمحے میں اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس کی بیوی وقت سے پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ کر آرام کی گہری نیند سو گئی تھی جس کے بعد کوئی جاگتا نہیں ہے۔

شرفو اب اکیلا رہ گیا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت نواب صاحب کی خدمت میں ہی گزرتا تھا۔ صاحب علی نواب صاحب کے دوست تھے۔ رام پور میں غالبؔ کی یاد میں ایک سیمینار ہو رہا تھا۔ نواب صاحب نے صاحب علی کو بھی اس سیمینار میں مدعو کیا تھا۔ وہ جب نواب صاحب سے ملے تو انہوں نے نواب صاحب کی شان میں قصیدے پڑھنا شروع کر دیئے کہنے لگے۔ ''حضور

کے دربار نے تو ہمیشہ ہی شاعروں اور ادیبوں کو خوب نوازا ہے۔ غالب، داغ، اور اقبال تک کو وظیفے ملتے رہے ہیں۔ یہ خاکسار بھی آپ کی نظرِ عنایت کے لیے ترس رہا ہے۔ زیادہ نہیں ایک خدمت گزار آپ کے یہاں سے مل جائے تو زندگی بھر آپ کو دعائیں دوں گا۔ دراصل بمبئی میں ہر چیز مل جاتی ہے گھر کا کام کرنے والے نوکر نہیں ملتے ہیں۔''

نواب صاحب نے اپنے دوست صاحب علی کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھا اور اپنے خاص خدمت گزار شرفو کو ان کی نذر کر دیا۔ اتنا ہی نہیں وہ شرفو کی سال بھر کی تنخواہ بھی بطور ایڈوانس صاحب علی کے بینک کھاتے میں جمع کر دیا کرتے تھے تاکہ صاحب علی ہر مہینے شرفو کو بہ آسانی اس کی تنخواہ وقت پر دے سکیں۔

صاحب علی اتر پردیش کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی باغیانہ طبیعت کی وجہ سے پہلے انھیں ماں باپ نے گھر سے نکالا پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بھی نکالے گئے۔ ان دنوں کمیونسٹ پارٹی کا بڑا زور تھا۔ اس پارٹی کو ایسے نوجوانوں کی بڑی ضرورت تھی جو ماں باپ، ملک وقوم، مذہب وملّت اور سماج سے بغاوت کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی نے صاحب علی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی تقریریں لچھے دار ہوتی تھیں اس لیے کہیں بھی مجمع لگانے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔

صاحب علی نے خوب زور وشور سے مجمع لگائے، ان میں شاعروں، ادیبوں کے علاوہ ناچنے گانے والوں کو بھی شامل کیا گیا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ صاحب علی جلد ہی سیاست دانوں کی نظر میں چڑھ گئے۔ غریبوں کی پارٹی کے سردار، امیروں کے دربار کے خاص مہمان اور دوست بن گئے۔ ملک کے وزیر اعظم اور وزیروں تک بے روک ٹوک ان کا آنا جانا ہو گیا۔ ملک کی زیادہ تر ادبی اکادمیوں اور اداروں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اب جو وہ چاہتے تھے وہی ہوتا تھا۔ ان کے اشارے کے بغیر ادب کی دنیا کا کوئی پتہ بھی نہیں ہلتا تھا۔ اوارڈوں کی بندر بانٹ ہی نہیں یونیورسٹیوں، اسکولوں اور کالجوں میں ٹیچروں، لیکچراروں اور پروفیسروں کا انتخاب بھی انھیں کے ہاتھوں میں تھا۔ اس لیے زیادہ تر غرض مند لوگ ان کی شان میں قصیدے پڑھتے دکھائی دیتے تھے۔ صاحب علی زمیندار باپ کے بیٹے تھے۔ گھر کی معمولی زمینداری چھوڑ کر اب وہ سب کے ذہنوں کی کھیتوں پر زمینداری کر رہے تھے جو اُن کے باپ دادا کی زمینداری سے زیادہ وسعت رکھتی تھی کیونکہ یہ ساری ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ بطور لگان ہر اکادمی کا بڑا انعام جو لاکھوں روپئے کا ہوتا تھا صاحب علی ہی کو ملتا تھا۔ ان کی شان میں بڑے بڑے جشن ہوتے تھے کیونکہ صاحب علی سب کے

ہیں جن کا مقصد و مدّعا دولت ہے، جن کا دھرم و دین دولت ہے، جن کا ایمان و آستھا دولت ہے اور جن کے ''دھندہ'' کا محور و مرکز دولت ہے! ابراہیم اشک نے اس کا پلاٹ موجودہ دور کے حالات سے اخذ کیا ہے، زیرِ بحث افسانے کا تانا بانا انھیں دو کرداروں کے وسیلے سے بُنا اور چُنا گیا ہے۔ آج کے مسموم ماحول اور معاملات اور ہندو مسلم تعصّب و تنفّر کے وسیع تناظر میں لکھا گیا یہ افسانہ اپنا جواز آپ ہے، دونوں نئے کرداروں کی پیدا وار ابراہیم اشک کے طبّاع ذہن اور ہمارے عہد کے معاشرے اور معاملے کی مشترکہ دین ہے، افسانے کے آغاز میں دونوں کرداروں کو کُلّیتاً منفی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اس کہانی کا انجام و اختتام ہمیں چونکاتا نہیں کیونکہ یہ نہ کوئی رمز ہے اور نہ راز، نہ ہی تحیّر خیز ہے، نہ ہی تجسّس آمیز کہ جس کا انکشاف کلائمکس (Climex) کی شکل میں ہوا ہو بلکہ دونوں کرداروں کا دھندہ اپنی پلاننگ کے برعکس نہیں، عین مطابق ہے اور جس کی توقع ہم پہلے سے کر لیتے ہیں۔ گرچہ ابراہیم اشک بنیادی طور پر شاعر و ناقد ہیں، صحافی و تاجر ہیں لیکن ان کا بحیثیت فنکار یہ امتیاز ہے کہ وہ ایک افسانہ نویس کے بطور بھی قدرے کامیاب ہیں۔ ان کی دو خصوصیات ایسی ضرور ہیں جو انھیں دوسروں سے جداگانہ تشخص بخشتی ہیں، پہلی یہ کہ وہ کبھی اس پہلو کو اپنے افسانے کا موضوع نہیں بناتے، جس کے جملہ نشیب و فراز سے بخوبی شناسا نہ ہوں، دوسری خوبی یہ کہ بذاتِ خود کسی تذبذب، ابہام اور نفسیاتی الجھن میں مبتلا نہیں، ذہنی طور پر وہ بدر جہا توانا اور تازہ کار ہیں، زمانے کے نباض ہیں، معاشرے کے مزاج داں ہیں اور مذہب کے نکتہ داں بھی ہیں، اسی کا ثمر پیش رس ہے کہ وہ زمانہ کی چالوں، عوام کی الجھنوں، سیاست دانوں کی گھاتوں اور مذہب کی انتہا پسندیوں کو بخوبی پہچان کر ''دھندہ'' جیسی عصری حسیّت سے مملو کہانی کو صفحۂ قرطاس کی زینت بناتے ہیں۔ اس میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ابراہیم اشک نے اپنی کہانی نویسی کے لئے ایک ایسی زمین، ایک ایسے موضوع، ایک ایسے پلاٹ نیز ایک ایسے مواد کا انتخاب کیا، جو نجر، پتھریلی، پھُس پھُسی، ناہموار اور دوراز کار نہیں، اس کے برخلاف، پختہ، پائیدار، ہموار اور عصرِ حاضر کے احوال، افعال اور افکار پر محیط ہے!

ابراہیم اشک کا اسلوبِ افسانہ، متاثر کُن ہے، ان کے طرزِ اظہار میں تازگی، سادگی، صفائی اور روانی، ان کے افسانوں کے اوزار و ہتھیار کہے جا سکتے ہیں، جس کے تعاون سے وہ اپنی تحریر کو بامعنی، بامقصد اور بااثر بنانے میں خاصے کامیاب ہیں۔ ان کا دِلِ دردمند، انسانیت کے نام پر دھڑکتا ہے، مظلوموں کی حمایت میں تڑپتا ہے اور مذہبی منافرت کے خلاف بھڑکتا ہے، جذبے کی دھیمی دھیمی آنچ سے حرارت آمیز ان کا اسلوب، قاری کا دھیان اپنی جانب بے محابا مائل و متوجہ

صاحب تھے۔

صاحب علی کے گھر آنے والے ادیبوں شاعروں کو شرفو کا نام بھی اچھی طرح یاد ہو گیا تھا۔ لوگوں کو تو اپنے صاحب کے کتے تک کا نام یاد ہو جاتا ہے۔ شرفو تو ان کا خدمت گار تھا۔ کتا نہیں تھا۔ شریف انسان تھا جو کسی پر بھونکتا یا کاٹتا نہیں تھا بلکہ انسانیت، اخلاق اور تہذیب سے پیش آتا تھا۔ وہ تہذیب جو اس کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی تھی، لیکن صاحب علی کی نظر میں اس کی قدر و قیمت کچھ بھی نہیں تھی۔ اگر کوئی شرفو کی ذرا سی بھی تعریف صاحب علی کے سامنے کرتا تو وہ خوش ہونے کی بجائے بھڑک اٹھتے تھے اور کہتے تھے۔ ''دراصل گھر کے نوکروں کو کبھی سر پر نہیں چڑھانا چاہئے۔ یہ چھوٹے لوگ ایک بار سر پر بیٹھ جائیں تو اتارنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

آئے دن صاحب علی کے یہاں شام کو شراب کی محفلیں سجتیں۔ شرفو شراب نہیں پیتا تھا لیکن ان محفلوں کا اہتمام کرنا خوب جانتا تھا۔ کبھی کوئی زیادہ پی لیتا اور اُلٹیاں کرنے لگتا تو شرفو ہی اس گندگی کو صاف کرتا اور ایسے لوگوں کو سنبھالتا۔ کھانا وہ ایسا بناتا تھا کہ جو بھی ایک بار اس کے ہاتھ کا کھانا کھالیتا زندگی بھر یاد رکھتا۔

رات کو شرفو سونے سے پہلے صاحب علی کے ہاتھ پاؤں دباتا اور سر کی مالش کرتا۔ ان کے کھانا کھانے کے بعد ہی شرفو سوتا تھا اور صبح پھر جلدی اُٹھ جاتا تھا۔ وہی صاحب علی کے کپڑے دھوتا اور پریس کرتا تھا۔ صاحب علی نہاتے تو اپنی چڈی بنیان تک دھونے کے عادی نہیں تھے۔ شرفو صابن لگا کر انہیں بھی چکا چک کر دیتا تھا، لیکن ان سارے کاموں کے باوجود صاحب علی نے کبھی شرفو کی تعریف نہیں کی، نہ ہی انہوں نے دس پانچ روپے خوش ہو کر اس کے ہاتھ میں رکھے تھے۔ جب کہ اس کی ساری خدمات اُنہیں مفت حاصل تھی کیوں کہ شرفو کی تنخواہ تو نواب صاحب پہلے ہی ادا کر دیتے تھے۔

پہلی بار مہینہ پورا ہونے پر صاحب علی نے جب شرفو کو تنخواہ دی تھی تو وہ رقم نواب صاحب نے اس کے لیے طے کی تھی اس سے آدھی تھی۔ شرفو روپے ہاتھ میں لے کر کچھ دیر سوچتا اور صاحب علی کی طرف دیکھتا رہا، لیکن صاحب علی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے خادم سے آنکھ ملا سکے۔ نیچی نظروں سے انہوں نے ایک واؤچر شرفو کے سامنے رکھ دیا جس پر اس کی تنخواہ کی پوری رقم لکھی ہوئی تھی۔ شرفو کو سمجھ میں نہیں آیا کہ صاحب علی ایسا کیوں کر رہے ہیں، لیکن ہر مہینے جب ایسا ہی ہونے لگا تو شرفو سمجھ گیا کہ صاحب علی اُن عظیم کمیونسٹوں میں سے ایک ہیں جو اپنے خدمت گاروں کو تنخواہ کی آدھی رقم دیتے ہیں اور پوری رقم پر دستخط کراتے ہیں۔

پورے پانچ سال کے بعد شرفو اپنے وطن رام پور جا رہا تھا۔ اپنی چاروں بیٹیوں اور ان کے بچوں سے ملنے۔ وہ بہت خوش تھا۔ بیٹیوں کے بچوں کے لیے وہ کچھ کھلونے خریدنا چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا بچے جب اسے نانا..... نانا کہہ کر پکاریں گے تو اسے کتنا اچھا لگے گا۔ نانا جب ان کو کھلونے دے گا تو وہ کتنے خوش ہوں گے۔ لیکن اچھے کھلونے خریدنے کے لیے اسے روپے بھی تو زیادہ چاہئیں۔ وہ سوچنے لگا کیوں نہ اس بار وہ صاحب علی سے تنخواہ کی پوری رقم مانگ لے۔ کمیونسٹ تو بڑے غریب پرور ہوتے ہیں۔ ہمیشہ غریبوں کی باتیں کرتے ہیں۔ کیا پانچ سال میں ایک بار کسی غریب کی تنخواہ کی پوری رقم نہیں دیں گے۔؟

اس بار بھی صاحب علی اسے تنخواہ کی آدھی رقم دے کر پوری رقم کے واوچر پر دستخط کرانے لگے تو شرفو نے ہمت بٹور کر کہہ ہی دیا۔ ''حضور اس بار مجھے اپنی تنخواہ کی پوری رقم دے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ بچوں کے لیے کھلونے لینا ہیں۔''

صاحب علی چونک کر بولے ''پوری رقم۔ کیسی پوری رقم؟''

شرفو تھوڑا مسکراتے ہوئے بولا۔ ''وہی حضور جتنی رقم کے واوچر پر آپ دستخط کراتے ہیں؟ جتنی نواب صاحب آپ کو ہمارے نام پر دیتے ہیں۔''

صاحب علی نے معنی خیز نظروں سے شرفو کو دیکھا اور جیب سے کچھ اور روپے نکالے۔ پھر گن کر شرفو کو پوری تنخواہ کی رقم دے دی۔

شرفو بہت خوش تھا۔ کہنے لگا۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے حضور۔ آپ جیسا غریب پرور میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میری بیٹیوں کے بچے آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔ میں انشاء اللہ وطن میں عید منا کر جلد ہی واپس آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

صاحب علی نے کہا۔ ''نہیں..... اب تم کبھی نہیں آؤ گے۔ مجھے اب تمہاری خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔''

شرفو کے دل میں آیا کہ وہ صاحب علی سے پانچ سال تک ہر مہینے کاٹی گئی تنخواہ کی آدھی رقم بھی مانگے جو ہزاروں روپے ہوتی تھی اور جو اس کے خون پسینے کی کھری کمائی تھی۔ جس پر اس کا حق بھی تھا لیکن اس غریب کو صاحب علی جیسے امیروں پر ترس آ گیا تھا اور اس نے اپنے وہ ہزاروں روپے بخشش کے طور پر صاحب علی کی جھولی میں خاموشی سے ڈال دیئے تھے۔

☆☆

ڈاکٹر محمد بشیر الدین

تجزیہ — بخشش

آج تکنک کے اعتبار سے کہانی جہاں سے باضابطہ چلی تھی پھر وہیں آ گئی۔ پریم چند کے دور میں واپسی سے اس میں نئی جان آ گئی ہے۔ گزشتہ چھٹی دہائی میں بے سمتی و بے راہ روی کا شکار ہوگئی تھی۔ جدیدیت نے تکنک میں محض نمایاں تبدیلی ہی نہیں کی تھی بلکہ مکمل ڈھانچہ ہی بدل کر تہس نہس کر دیا تھا، جس کا خمیازہ افسانوی ادب کو بھگتنا پڑا تھا۔ اول تو قارئین کی تعداد گھٹتی اور سمٹتی گئی اور کہانی ایک انبوجھ پہیلی یا چیستاں و معما (Enigma) بن کر عقدہ لاینحل ہونے لگی تھی۔ خوش آئینہ پہلو یہ ہے کہ اب بے راہ روی کا شکار نہیں بہت جلد اپنی بھولی ڈگر پہ واپس آ گئی ہے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہ کہنا چاہئے۔ کہانیاں اکثر و بیشتر لوگوں کو سمجھ میں آنے لگی ہیں۔ قارئین کا حلقہ اچھا خاصا بڑھ گیا ہے۔ مزید بڑھنے کی توقعات ہیں۔ ''بخشش'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جو محض بیانیہ انداز بیان کی عمدہ مثال ہی نہیں پیش کرتی بلکہ ابراہیم اشک کی ایک حسین تخلیقی پیشکش (Offer) بھی ہے۔

''بخشش'' دراصل شرافت علی سے شرفو بننے کی عبرت آموز کہانی ہے۔ یوں تو ضمنی کرداروں کی کمی نہیں، لیکن سب کے سب ڈرامائی انداز سے چند ثانیے کے لیے کروفر کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں اور پھر پردہ گرتے ہی ایسے غائب ہو جاتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سنگ۔ کہانی کا مرکزی کردار شرفو بذات خود ایک ایسے خانوادے کا چشم و چراغ تھا جہاں کبھی خوشحالی اور فارغ البالی (Easy circumstances) قدم چومتی تھی۔ لیکن وقت اور قسمت بدلتے اور بنتے بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ حالات کی ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کل کا شرافت علی جو سیدزادہ و شریف زادہ تھا آج شرفو بن کر ایک نواب سے دوسرے نواب کے یہاں غیر ذی روح اشیا کی طرح منتقل ہو رہا ہے۔ تنخواہ کوئی اور دیتا ہے خدمت کسی اور کی کرنی پڑتی ہے اور وہ بھی آدھی تنخواہ کی رقم پر

اکتفا کر کے پوری تنخواہ کے واؤچر پر دستخط کرنا پڑتا ہے۔ آخر وہ کون سے عوامل ہیں جنھوں نے اس موڑ پر لا کھڑا کیا کہ ایک رئیس زادہ خادم بن کر زندگی کے مہ و سال کاٹنے پر مجبور ہے۔

کہانی میں صورت حال (Situation) جو تخلیق کی گئی ہے اس کی نوعیت کچھ اس طرح ہے۔ شرفو کے باپ دادا رام پور کے نواب کے دربار میں اونچے عہدے پر رہ چکے تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد بیوہ ماں نے فوراً اس کی شادی کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چار لڑکیوں کا باپ بن گیا۔ ماں کے انتقال کے بعد دربار میں ملازمت کے سہارے کسی طرح زندگی کی گاڑی کھینچتا رہا۔ بیوی چونکہ فطرتاً وفادار و غمگسار تھی، کسمپرسی کی حالت میں بھی پائی پائی جمع کر کے لڑکیوں کی شادی یکے بعد دیگرے کر کے فوراً ہی شرفو کو تن تنہا، بے یار و مددگار چھوڑ کر وقت سے پہلے ہی داغ مفارقت دے گئی۔

شرفو کے خانوادے کی کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اپنے آپ میں خود ایک مکمل افسانہ ہے۔ اگر اس حصہ کو کہانی سے الگ بھی کر دیا جائے تو کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ کہانی کار کا سارا زورِ قلم اس کے بعد کی زندگی جو دوسرے نواب کے یہاں شرفو نے بسر کی ہے پر صرف ہوا ہے۔ کہانی کے اخیر میں شرفو رام پور جا کر نانا کی صورت میں اپنی بیٹیوں کے بچّوں سے ملنا چاہتا ہے۔ کھلونے خریدنے کے لیے پوری تنخواہ کا مطالبہ کرتا ہے لیکن یہ امر مبہم ہی رہتا ہے کہ وہ اپنی آدھی تنخواہ کی رقم کہاں خرچ کرتا ہے۔ شرفو کا یہ خانوادہ فرضی بھی ہو سکتا تھا جس کا آغاز یہیں سے ہوتا اور پہلے سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہانی بے جا طوالت سے بچ جاتی اور دوسری کہانی ہی محض مرکز توجہ بنتی، جس کا وہ سو فی صدی مستحق بھی ہے، گویا ''بخشش'' ایک نہیں دو کہانی کا نام ہے۔ دوسری کہانی فنی اعتبار سے قدرے مختلف ہوتے ہوئے بھی پہلی کی طرح ہی سیدھے سپاٹ اور سلیس انداز کی ہے لیکن فکری اعتبار سے کینوس وسیع ہونے کے چلتے نہایت پیچیدہ و ژولیدہ ہے۔ اس ژولیدی (Perplexity) نے کئی اہم افکار کو جنم دیا ہے جو بے حد غور طلب ہیں۔ کہانی کا پس منظر دو واضح اور ایک مبہم گویا تین نوابوں کا جاگیردارانہ درہم برہم ہوتا ہوا نظام ہے۔ خاندانی جاہ و جلال، جاہ و حشم، جاہ و منصب، روب و دبدبہ اور رئیسانہ خود ساختہ غرور و تکبر اور سب و شتم کے دیکھتے الاؤ کو رفتہ رفتہ سرد ہونے کا المیہ بھی ہے۔

صاحب علی کی باغیانہ طبیعت راس نہ آئی۔ والدین نے گھر سے بے دخل کر دیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکالے گئے۔ کمیونسٹوں کو باغی نوجوانوں کی تلاش تھی لہٰذا پارٹی کی سربراہی نصیب ہو گئی۔ اب کیا تھا ان کا طوطی بولنے لگا۔ کہانی کار کے جملے ہیں:

''ان کے اشارے کے بغیر ادب کی دنیا کا کوئی پتہ بھی نہیں ہلتا تھا۔ اوارڈوں کی بندر بانٹ ہی نہیں.....ٹیچروں اور پروفیسروں کا انتخاب بھی انہیں کے ہاتھوں میں تھا.....صاحب علی زمیندار باپ کے بیٹے تھے گھر کی معمولی زمینداری چھوڑ کر اب وہ سب کے ذہنوں کی کھیتیوں پر زمینداری کر رہے تھے.....کیونکہ صاحب علی سب کے صاحب تھے''۔

ایک اور نواب صاحب جو صاحب علی کے دوست بیحد خوش مزاج اور بندہ نواز جس کا بھرپور فائدہ صاحب علی نے اٹھایا، رام پور میں غالبؔ کی یادگار میں ہونے والے سیمینار میں مدعو ہوئے تو دوست کی شان میں قصیدہ پڑھنے کے بعد یوں اظہارِ مدعا کیا:

''حضور کے دربار نے تو ہمیشہ ہی شاعروں اور ادیبوں کو خوب نوازا ہے .....زیادہ نہیں ایک خدمت گزار آپ کے یہاں سے مل جائے تو زندگی بھر آپ کو دعائیں دوں گا۔ دراصل بمبئی میں ہر چیز مل جاتی ہے گھر کا کام کرنے والے نوکر نہیں ملتے ہیں۔''

نواب صاحب نے نہ صرف یہ کہ حقِ دوستی نبھایا بلکہ صاحب علی کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھ کر اپنا وفادار خادم شرفو کو ان کے حوالے کر دیا۔ اور سال بھر کی تنخواہ بھی ان کے کھاتے میں جمع کر دیا تا کہ تنخواہ دینے میں دشواری نہ ہو۔ قسمت کا مارا صوم وصلوٰۃ کا پابند، روزانہ تفسیر کے ساتھ قرآن پڑھنے والا شرفو صاحب علی کے یہاں آیا تو یہاں کا ماحول اس کے مزاج کے بالکل برعکس تھا۔ خادم وآقا کے طبعی میلانات میں سخت تضادات کے باوجود اس نے اپنے کسی حرکت وعمل سے ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اپنے آقا کے ذریعہ شراب وکباب کی محفل کا اہتمام سے نالاں ہے۔ شراب نہیں پیتا تھا لیکن اس کی محفل کا اہتمام شوق سے کرتا، کثرت شراب نوشی سے الٹیاں کرنے کے بعد پھیلی گندگی کو صاف کرتا، نشے میں دُھت مہمانوں کو سنبھالتا، مالک کی چڑی بنیان تک صاف کرتا، لذیذ کھانے بناتا جو ایک بار کھالے تو عمر بھر یاد رکھے، تاہم اس کی خدمات کی تعریف نہ کی جاتی، نہ دس پانچ روپے بطور انعام دیئے جاتے جس کا اسے سخت انتظار تھا اور قلق بھی۔ ٹھیک ہے شرفو ان کا اپنا نوکر نہیں تھا دوست کا ہی تھا لیکن ساری خدمات مفت حاصل تھیں عوضی کوئی اور دیتا تھا۔ ناروا سلوک کا شکوہ شرفو کو تھا لیکن زبان بند تھی، لب کشائی کی جرأت کیسے کرتا انسانی تقاضے کے تحت شرفو جیسے تعلیم یافتہ، وفادار، ایماندار، سلیقہ شعار، غمگسار خادم کی خدمت گزاری کا اعتراف خندہ پیشانی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے۔ حوصلہ افزائی کے کلمات تو درکنار

اگر کوئی تعریف کر دیتا تو صاحب علی جل بھن جاتے اور غم و غصہ کا اظہار یوں کرتے:

''دراصل گھر کے نوکروں کو کبھی سر پر نہیں چڑھانا چاہئے۔ چھوٹے لوگ ایک بار سر پر چڑھ جائیں تو اتارنا مشکل ہو جاتا ہے''

ناروا سلوک کو نوابوں کی نفسیات پر محمول کیا جا سکتا ہے یا پھر جغرافیائی خصوصیت (Topography) کے زمرے میں رکھ کر جزویات نگاری (Minor Details) کا بھی نام دیا جا سکتا ہے جس سے فن میں بانکپن اور پائیداری آتی ہے۔ شرفو کی کردار نگاری پر سیدھا، سپاٹ اور یک رخا ہونے کا گمان غالب ہوتا ہے جو کچھ حد تک غیر فطری (Unnatural) معلوم ہوتا ہے، لیکن فنی چابکدستی نے اس الزام کو مسترد کر کے بقائے دوام کی نعمت سے سرفراز کر دی ہے۔ شرفو سب کچھ خاموشی سے کیوں سہہ لیتا ہے۔ ردِ عمل کا اظہار اس کی ذات سے کیوں نہیں ہوتا۔ خدمات و معمولات میں کسی طرح کی کوتاہی کو دخل نہیں دیتا، نہ تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کرتا ہے، لیکن وہ بھی تو تمام اشرف المخلوقات کی طرح اسی آب و گل سے بنا ہے انسان۔ اس کا شعور بیدار ہے۔ اس کا ضمیر اس سے سوال کرتا ہے کہ اپنی خاموشی کو زبان کیوں نہیں دیتا۔ یہاں بھی کئی امور کارفرما ہیں۔ ممکن ہے محدود اخراجات خاموشی کا سبب یا بھر دربدری کا خوف بھی لاحق ہو سکتا ہے۔ جب اس کے جذبات امڈ پڑتے ہیں تو آخر کار صبر و تحمل کا پیمانہ چھلک جاتا ہے۔ اور یہیں سے Reaction یعنی ردِ عمل کا آغاز ہوتا ہے جو کردار نگاری کے یک رخا عیب کو زائل کر دیتا ہے۔ پانچ سال کی مدت کے بعد گھر جانے کا ارادہ کرتا ہے، اخراجات کی طویل فہرست پوری تنخواہ مانگنے کے لیے اکساتی ہے، اس امید پر کہ کمیونسٹ تو غریب پرور ہوتے ہیں، معاشی مساوات کی تعلیم دیتے ہیں، ایک بار ضرور پوری تنخواہ دے دیں گے۔

شرفو کی جہاں دیرینہ انعام و اکرام کی تمنا دم توڑ چکی تھی وہیں پوری تنخواہ کی تمنا کا بھی خون ہونے کے توقعات نظر آنے لگے تھے۔ پوری تنخواہ کے واؤچر پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا تو غریب کی تلملاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ بڑی مشکل سے ہمت جٹا کر ملتجیانہ انداز و لہجے میں ہی سہی اظہارِ مدعا کچھ یوں کیا:

''حضور! اس بار مجھے اپنی تنخواہ کی پوری رقم دے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ بچوں کے لیے کھلونے لینا ہیں۔''

صاحب علی کی عیاری کا علم شرفو کو پہلے سے ہی تھا لیکن کہانی کار نے بڑی چالاکی سے اس امر کو مبہم رکھا ہے جس کا انکشاف شرفو کی ذات سے اخیر میں ناگہاں ہو جانے سے صاحب علی

کے استعجابات بڑھ جاتے ہیں اور شرفو کی فہم و فراست سے لاعلمیت کا اظہار کرتے ہوئے تجاہل عارفانہ انداز میں یوں کہتے ہیں— ''پوری رقم! کیسی پوری رقم!!''

اب چونکہ حالات نے شرفو کی دیرینہ خاموشی کو قصداً توڑ دی تھی، تاہم وفاداری و انکساری کا دامن تھامے ہوئے زیرلب مسکراتے ہوئے اپنے پہلے مالک کے ذریعہ دی گئی پوری تنخواہ کی کہانی سنا دیتا ہے۔ اب کیا تھا ڈھول کا پول کھل گیا تھا۔ صاحب علی کھسیانی بلّی بن کر کھمبا نوچنے لگے تھے۔ شرفو کی پوری تنخواہ آخری بن کر مل جاتی ہے۔ ملازمت سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ یہاں بھی یہ امر بیحد توجہ طلب ہے۔ پوری تنخواہ کی خوشی کے سائے میں چھپا زندگی بھر کا غم کا انداز ہوتا تو شاید مطالبہ مسترد بھی کر دیتا یا نہیں بھی، غیر واضح ہی ہے۔ فوراً شرفو کے دل میں خیال آیا کہ پانچ سال کے آدھی تنخواہ کی رقم کا مطالبہ کرے۔ چونکہ اس کا ہاتھ کٹ گیا تھا۔ کوئی تحریری سند نہ تھی کہ قانونی چارہ جوئی کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا، اس کی شرافت اور مجبوری نے مشترکہ فیصلہ کیا جو صاحب علی جیسے امیر و کبیر آدمی پر ترس بنام مجبوری کی شکل میں صادر ہوا۔ شرفو نے اپنے ہزاروں روپے بطور بخشش صاحب علی کی جھولی میں خاموشی سے ڈال کر اپنا غم غلط کیا۔ ایسا کر کے اپنی دانش مندی کا بین ثبوت اختتام پر ہی سہی لیکن فراہم کیا۔ یہیں کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ اشتباہ یہی کہانی کا فکری عروجی نقطہ ہے۔ اگر فیصلہ کوئی اور ہوتا تو شاید سانپ بھی نہ مرتا اور لاٹھی بھی ٹوٹ جاتی۔ اس طرح فن مجروح ہو جاتا جو فنکار کے لیے ہتک آمیز ہوتا۔

آقا شرابی، خادم نمازی دو متضاد میلان طبع سے فنی و فکری دونوں حسن نکھر گیا ہے۔ ظاہر ہے شئے کی شیعت تضاد سے متعین ہوتی ہے اور حسن پیدا ہوتا ہے کائنات کی تخلیق میں یہ امر بیحد کارفرما ہے۔ ستم زدہ شرفو نے تجاوز یا انحراف کی جرأت کیوں نہیں کی۔ سب و شتم سہتا رہا۔ ناروا سلوک کا گلہ شکوہ بھی نہ کیا، کرتا بھی تو سننے والا کون تھا۔ اب اس کے علاوہ شاید کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ بخشش و انعام جو وقتاً فوقتاً آقا کی جانب سے خادم کی خدمات سے خوش ہو کر ملتے رہتے ہیں نہ ملے، حالانکہ وہ مستحق تھا، ملنا چاہئے تھا۔ دل کے نہاں خانے میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھتا رہا کہ آخر لمبی مدت کی خدمات میں کہاں اور کون سی کوتاہی ہوئی جس بنا پر اس کی ادنیٰ خواہش کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ٹھیک ہے مالک نوکر کو نہ نواز سکا تو نوکر ہی مالک کو کیوں نہ نواز دے۔ یہ نوازش جو شرفو کی ذات سے حرکت عمل میں آتی ہے حسب توقع تو نہیں لیکن مالکانہ نظام و رویہ پر تیکھا طنز ہے جو سبق آموز بھی ہے۔ علاوہ ازیں اسی نے کہانی میں ایک نیا موڑ دے کر زندہ و پائندہ کر دیا ہے۔ کہانی کے بطن سے یوں تو کئی لیکن دو واضح افکار جنم لیتے نظر آتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اشتراکی نقطۂ نظر سے

دولت کے مساوی تقسیم کے علم بردار کمیونسٹوں کے ڈھول کا پول کھل گیا ہے۔ اشتراکی نظام حکومت کے منشور (Manifesto) کے مطابق غریب ومزدوراور دبے کچلے افراد کے استحصال (Exploitation) کے خلاف نعرہ احتجاج بلند کرنا اوران کے جائز مطالبات کو دلوانا ان کا نصب العین ہے۔ ممکن ہے اشتراکی نظام کی ناکامیابی کے وجوہات کی فنی وضاحت کے بعد طنز کا نشانہ بنانے کی سعی ہو۔ صاحب علی کی استحصالی صورت پنہاں وپوشیدہ تھی عیاں ہوگئی ہے جو نہایت کریہہ وگھنونی ہے۔ ان کا مکمل وجود گندم نما جوفروش (Hypocrite) کا مصداق بن گیا ہے۔

ایک گمان یہ بھی غالب ہوتا ہے کہ اخراجات کے لحاظ سے اشتراکی نظام کو فروغ دینے کی غرض سے نصف تنخواہ دینے کا فیصلہ تو نہیں کیا گیا ہے جو نجی ضرورت کی تکمیل کے لیے کافی ثابت ہوتی ہے۔ تو پھر یہ فیصلہ اشتراکیت کے منافق نہیں موافق ہے۔ بہرحال کہانی کار نے افکار کے دونوں دروازے کھول رکھے ہیں۔ فیصلہ قارئین وناقدین کو کرنا ہے کہ کس دروازے داخل ہوں کہ فنکار کے فکری پہلو کا سراغ لگایا جاسکے جو خواص ہی نہیں عوام الناس کے لیے بھی تشفی بخش اور مطمئن کن ہو۔ یہاں فکری پیچیدگی از خود واضح ہو جاتی ہے جو کمال فن کا مظہر بھی ہے۔

Chishti pur, Asthawan
Nalanda - 803107 (Bihar)

☆☆

خدا کی قسم

ماما پنجابی بڑا ہی خود پرست آدمی تھا۔ اس کی صبح گرودوارا جانے سے شروع ہوتی تھی۔ وہاں سے نکل کر وہ سیدھا سیفی ہوٹل جا کر قیمہ اور ڈبل روٹی کا ناشتہ کرتا پھر اپنے لیے خالص دودھ کی اسپیشل چائے بنوا کر پیتا۔ تب تک دس ساڑھے دس بج جاتے تھے۔ سیفی ہوٹل سے چائے ناشتہ کر کے وہ بینک جاتا اور لین دین کے لیے روپے نکالتا۔ وہ لوگوں کو سود پر روپے دیتا تھا۔ سود کی رقم پانچ سے دس فی صد ہوتی تھی۔ ضرورت مند لوگ اس سے روپے لیتے اور سود زیادہ ہونے کی وجہ سے جلد لوٹا بھی دیتے تھے۔ روپے دیتے وقت پنجابی ماما شہر کے منشی مرلی منوہر سے پرامیسری نوٹ لین دار کے نام لکھوا کر دو گواہوں کی دستخط کروانا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ ماما پنجابی کو خدا کے بعد ملک کے قانون پر پورا بھروسہ تھا اور اسی بھروسے کے تحت وہ یہ چھوٹی سی قانونی کارروائی کیا کرتا تھا تا کہ اس کی سود پر دی گئی رقم محفوظ رہ سکے۔

ماما پنجابی سے سود پر روپے لینے والوں میں شہر کے لوگ تو تھے ہی آس پاس کے گاؤں کھیڑے کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھانے لگے تھے۔ ماما کی شہرت ایک سوشل ورکر کی طرح ہر طرف پھیل گئی تھی۔ لوگ اسے عزت کی نظر سے دیکھتے اور اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ وہ شہر میں جدھر سے گزرتا لوگ قدم قدم پر اسے ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے۔ چناؤ آتے تو سیاسی لیڈر ماما کی مقبولیت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ ماما پنجابی کے ایک اشارے پر چناؤ کا پانسہ پلٹ جاتا۔ وہی اُمیدوار جیتتا جس کی سفارش ماما پنجابی کرتا تھا۔

حشمت خاں شہر سے کچھ دوری پر بسے رسول گڈھ گاؤں کے پٹیل تھے۔ اپنے گاؤں میں ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ اسی دبدبے کی وجہ سے انھوں نے کئی چھوٹے کسانوں اور دلت لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ گاؤں کے پٹواری، شہر کے تحصیلدار اور تھانیدار سے حشمت خاں کی دوستی کا چرچا عام تھا۔ آئے دن ان لوگوں کی دعوتیں حشمت خاں کے بنگلے پر ہوتی تھیں۔ سال میں دو

تین بار ایسا بھی ہوتا کہ اپنے عزیز رشتہ دار کی شادی یا اپنے جنم دن کی پارٹی میں اُجین کے کوٹھے کی طوائفوں کو وہ اپنی محفل رنگین بنانے کے لیے بلاتے۔ ایسے موقعوں پر دو تین دنوں تک ساری ساری رات ناچ گانا ہوتا جس میں سرکاری افسروں اور شہر کے رئیسوں کی بھیڑ جمع رہتی۔ ایسی محفلوں میں شام ہونے کے لیے حشمت خاں ماما پنجابی کو بھی خاص طور سے دعوت دیتے لیکن وہ ایسی کسی محفل میں آج تک شامل نہیں ہوا تھا۔ حشمت خاں کا لین دین بھی اکثر ماما پنجابی کے ساتھ ہوتا رہتا تھا۔ وقت سے پہلے ہی وہ ماما کی رقم واپس لوٹا دیتا تھا۔

اس بار حشمت خاں نے ماما پنجابی سے پچیس ہزار روپے ادھار لیے تھے۔ ایک مہینے کے اندر رقم واپس لوٹانے کا وعدہ کیا تھا لیکن مہینہ پورا ہو جانے کے باوجود حشمت خاں نے اب تک یہ رقم نہیں لوٹائی تھی۔ نہ ہی اس درمیان ماما کی ملاقات ہی اس سے ہوئی تھی۔ ڈر اس بات کا تھا کہ اس لین دین کی لکھا پڑھی بھی نہیں ہو سکی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ اس روز حشمت خاں ماما پنجابی کو ڈھونڈتا ہوا اس کے گھر جیپ لے کر رات کو دس بجے پہنچا تھا اور پچیس ہزار روپے ادھار مانگے تھے۔ ماما دن بھر کا تھکا ہوا تھا اسے نیند آ رہی تھی، ایسی حالت میں منشی مرلی منوہر کے گھر جا کر پرامیسری نوٹ لکھانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ پھر حشمت خاں کے ساتھ کئی بار وہ لین دین کا بیوپار کر چکا تھا اور اس نے اسے کھرا پایا تھا۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ماما نے اسے روپے دے دیئے تھے۔

روپے دیتے ہوئے ماما پنجابی نے کہا تھا ''پٹیل صاحب بغیر لکھا پڑھی کے آپ کو میں یہ پچیس ہزار روپے دے رہا ہوں۔ نہ گواہ ہے نہ کوئی ثبوت۔ اس لین دین کو دیکھنے والا صرف خدا ہے اسی کے بھروسے پر میں یہ کام کر رہا ہوں۔''

حشمت خاں نے کہا تھا۔ ''ماما، آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایک مہینے کے اندر اندر میں آپ کو رقم لوٹا دوں گا۔''

مہینہ پورا ہو گیا تو ماما کی فکر بڑھنے لگی۔ وہ حشمت خاں سے مل کر اپنی رقم واپس لینے کے لیے پریشان ہونے لگا۔ ایک دن ماما شہر کے چوراہے پر کھڑا تھا کہ اس نے دیکھا سامنے سے حشمت خاں کی جیپ چلی آ رہی ہے۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے جیپ کو روکنا چاہا لیکن وہ نہیں رکی۔ آگے بڑھ گئی۔ ماما پنجابی نے پیچھے سے بار بار حشمت خاں کو آواز لگائی لیکن حشمت خاں نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ ماما پنجابی کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ حشمت خاں کے دل میں بے ایمانی آ گئی ہے۔ جس طرح اس نے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے

کر لیتا ہے، صداقت وثبوت کے لئے نثر پارہ دیکھئے:

''دھندے کے بارے میں سوچتے سوچتے انھیں ایک خیال آیا۔ جس نے ساری دنیا بنائی ہے، زمین آسمان بنائے ہیں، سب لوگ جسے مانتے اور پوجتے آئے ہیں، کیوں نہ اسی کے نام پر دھندہ کیا جائے۔ اگر چل گیا تو زندگی بن جائے گی۔ انھوں نے سوچا وہ خدا کے نام کو بیچیں گے، ایشور کے نام کا بیوپار کریں گے، اگر مارکیٹنگ صحیح ہوگئی تو ان کے دھندے کو کوئی روک نہیں پائے گا کیوں کہ وہ تو ملکوں کے قانون اور سمودھان سب سے اوپر ہے۔ اس کے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ سارے غیر قانونی کام اس کے نام پر کئے جاسکتے ہیں نہ کوئی ٹیکس دینا پڑتا ہے، نہ کوئی اور جھمیلا ہے۔''

(دھندہ، ابراہیم اشک)

مذکورہ اقتباس کے بنظرِ غائر مطالعے سے کئی معنی خیز باتیں سامنے آتی ہیں مثلاً کہانی کا عنوان ''دھندہ'' چونکہ ہندی شبد ہے، اسی کی مناسبت سے ابراہیم اشک نے بڑی چالاکی و چترائی سے اس مختصر اقتباس میں بیالیس (42) ہندی شبد اور صرف دو انگریزی لفظ، جو کہانی کی مناسبت اور وزن ووقار کے لئے ناگزیر تھے، ''مارکیٹنگ'' اور ''ٹیکس'' استعمال کئے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے صرف (12) اُردو، (فارسی اور عربی نژاد) الفاظ لکھے ہیں۔ ان کا یہ پیراگراف ہمیں میر امن دہلوی کی سدا بہار تخلیق ''باغ وبہار'' کی یاد تازہ کراتا ہے، ابراہیم اشک کے شعور یا لاشعور میں بھی غالباً ''باغ وبہار'' کا سادہ وسلیس، سجل وسبھ اسلوب کہیں چسپاں وپیوستہ ہے، اسی لئے ان کا یہ طرزِ سادہ اور عوامی اسلوب ہندوستان میں بسنے والے تمام ہندو مسلمانوں، عورتوں، مردوں، نر، ناریوں، بچّوں، بالوں، بنگالیوں، مدراسیوں، گجراتیوں، مراٹھیوں، پنجابیوں اور عیسائیوں کے باوصف عالموں، ناقدوں سب کے لئے پُرکشش اور بآسانی سمجھ میں آنے والا ہے۔

راقم کے خیال میں، اشک کے اس افسانے کا نام تو ''دھندا'' ہے لیکن اس کے علی الرغم، قارئین کو رجھانے اور لبھانے کا بھی اچھا ''پھندا'' ہے۔

''دھندہ'' کے بین السطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں بے نامی فطین کردار اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے ہندوستان کے موجودہ ماحول سے اپنا مالی اور نامی دونوں طرح کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے ملک کو جانی، مالی، صنعتی، تہذیبی، مسلکی، مذہبی اور نظریاتی اعتبار سے جو زبردست نقصان ایسے شرپسند کرداروں کے ذریعہ پہنچایا جارہا ہے، وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، اس

کسانوں کی زمینیں ہڑپ لی ہیں اسی طرح اس کے پچیس ہزار روپے بھی ہڑپ لے گا۔ یہی سوچ سوچ کر وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح جلدی اٹھا، نہادھو کر گرودوارا گیا اور وائے گرو کے سامنے سر جھکا کر دعائیں مانگتا رہا کہ وہ اسے اس بھاری نقصان سے بچائے۔ پچیس ہزار روپے اس کے لیے بڑی رقم تھی۔ اس کا ڈوبنا اس کے لیے بھاری نقصان ہی تھا۔

گرودوارا سے نکل کر وہ روزانہ کی طرح سیفی ہوٹل پر ناشتہ کرنے گیا۔ آج اسے قیمہ اور ڈبل روٹی بے مزہ لگ رہے تھے۔ اس نے آدھا کھایا اور آدھا یوں ہی چھوڑ دیا۔ چائے بھی اسے آج اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ہر گھونٹ اسے زہر کے گھونٹ کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ کاؤنٹر پر جب وہ بل دینے لگا تو ہوٹل والے سے شکایت کرنے لگا۔ ''آج کل نہ تو تمہارے یہاں قیمہ اچھا بنتا ہے، نہ چائے ہی مزیدار ہے۔ سب بیکار ہے، بکواس ہے۔''

ہوٹل مالک سوچ میں پڑ گیا۔ ماما پنجابی نے پہلی بار ایسی شکایت کی تھی۔ اس لیے اس پر دھیان دینا لازمی تھا۔ ماما کے چلے جانے کے بعد اس نے خانساماں کو بلا کر ڈانٹا اور ہر چیز کا ذائقہ برقرار رکھنے کی ہدایت دینے لگا۔

ماما پنجابی جلد سے جلد حشمت خاں سے ملنا چاہتا تھا۔ شہر سے رسول گڑھ دو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس نے ایک کرائے کی سائیکل لی اور چل پڑا۔ آج بہت دنوں کے بعد وہ سائیکل چلا رہا تھا۔ پانچ دس منٹ اسے ذرا اٹپٹا لگا پھر سڑک پر اس کی سائیکل آرام سے دوڑنے لگی۔ دن کے بارہ بجے تھے جب وہ حشمت خاں کے گھر پہنچا۔ حشمت خاں اندر کے کمرے میں تھا۔ گھر کے نوکر نے اندر جا کر اسے بتایا کہ ماما پنجابی اس سے ملنے آیا ہے، حشمت نے اسے کمرے میں بیٹھانے اور چائے پانی پلانے کا نوکر کو حکم دیا۔ ماما پنجابی بیٹھک میں بیٹھا حشمت خاں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا ایک ایک پل کسی انتشار بھری صدی سے کم نہیں تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ آدھا گھنٹہ اسی طرح جل بھن کر کباب بننے میں گزر گیا تب کہیں جا کر حشمت خاں بیٹھک میں آیا۔ آتے ہی اس نے بڑی گرمجوشی سے ماما پنجابی کو گلے لگایا۔ پھر انجان بن کر پوچھنے لگا۔

''کیسے آنا ہوا ماما جی؟ کیا گاؤں میں کسی سے وصولی کرنا ہے؟''

''ہاں، پٹیل صاحب! وصولی کے لیے ہی آیا ہوں۔'' ماما پنجابی نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''تو ہو گئی وصولی؟'' وہ مسکرایا۔

''نہیں، ابھی کہاں ہوئی۔'' ماما نے کہا۔

''تو پھر کر لیجئے وصولی اور دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایئے۔ کون آدمی ہے؟ کتنے روپے دیئے ہیں؟ اگر میری ضرورت ہو تو چلتا ہوں آپ کے ساتھ!'' حشمت نے بات بناتے ہوئے کہا۔

''وصولی تو آپ ہی سے کرنا ہے پٹیل صاحب! وہ پچیس ہزار روپے جو میں نے آپ کو دیئے تھے۔'' ماما نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

حشمت خاں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، ''واہ! بہت اچھا مذاق کر لیتے ہیں آپ بھی۔ میں اور پچیس ہزار روپے آپ سے یوں لوں گا بھلا؟ میرے پاس کس بات کی کمی ہے؟''

''مذاق تو آپ کر رہے ہیں پٹیل صاحب۔ اچھا ہوتا میں لکھا پڑھی کر لیتا تو یہ نوبت ہی نہیں آتی۔ میں نے آپ پر بھروسہ کیا، آپ کو عزت دی اُس کا یہ صلہ ملے گا میں نے کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا۔'' وہ نراش ہو کر بولا۔

''دیکھئے آپ ایک شریف آدمی کے گھر میں بیٹھ کر اس پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں۔ میں چاہوں تو ابھی آپ کو دھکے مار کر باہر نکال سکتا ہوں، لیکن میں ضبط کر رہا ہوں۔''

''آپ گاؤں کے پٹیل ہیں۔ لوگوں کو گھر سے دھکے مار کر نکالنا آپ کے یہاں کی پرانی پرمپرا رہی ہے۔ مجھے بھی آپ ضرور دھکے مار کر نکال ہی سکتے ہیں۔ جہاں تک ضبط کی بات ہے کون کتنا ضبط کر رہا ہے یہ تو اوپر والا جانتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں نے اس روز رات میں دس بجے آپ کو پچیس ہزار روپے دیئے تھے جس سے آپ مکر رہے ہیں۔'' ماما نے کہا۔

''اس میں مکرنے کی کیا بات ہے مامی جی! آپ پچیس ہزار روپے کی بات کر رہے ہیں میں نے تو آپ سے پچیس پیسے بھی نہیں لیے ہیں۔'' حشمت خاں نے زور دے کر کہا۔

''یہی بات آپ مسجد میں قرآن اٹھا کر کہہ دیں پٹیل صاحب! میں خدا کے نام پر پچیس ہزار روپے بھول جاؤں گا۔'' ماما پنجابی نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس اتنی سی بات! ماما جی میں مسجد میں قرآن اٹھا کر بھی یہ بات کہہ سکتا ہوں۔ سانچ کو آنچ کیا ہے۔'' حشمت خاں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

مامی جی کو خدا اور اس کے قانون پر بھروسہ تھا انہوں نے گاؤں کے پانچ آدمیوں کو اکٹھا کیا اور حشمت خاں کو ساتھ لے کر گاؤں کی مسجد میں گئے جہاں حشمت خاں نے وضو کر کے قرآن ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ''میں پاک پروردگار خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ماما پنجابی سے پچیس ہزار روپے ادھار نہیں لیے۔''

ماما کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اس نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا تھا۔ اب وہی انصاف کرنے والا تھا۔ مسجد سے باہر نکلتے وقت حشمت خاں نے جب ماما سے گھر چل کر دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا۔ ''تمہارے گھر کا تو پانی پینا بھی میرے لیے حرام ہے پٹیل صاحب! خدا کی ذات کو آپ نے سمجھا ہی نہیں۔ محض پچیس ہزار روپے کے لیے آپ اس کی جھوٹی قسم کھا گئے۔ اس کا عذاب تم پر ایسا نازل ہوگا کہ تمہیں کوئی پناہ دینے والا نہیں ملے گا۔'' ماما نے اپنی سائیکل اٹھائی اور شہر کی طرف چل دیا۔

اس واقعہ کو سال بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ حشمت خاں کے بیس سالہ جوان بیٹے کو ایک دن جنگل میں سانپ نے ڈس لیا اور اس کی وہیں موت ہوگئی۔ دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ حشمت خاں کی بیوی جوان بیٹے کے غم اور ٹی بی کی بیماری سے مرگئی۔ کنوؤں کا پانی سوکھ گیا، فصلیں چوپٹ ہونے لگیں، بینکوں کے قرض اتنے بڑھ گئے کہ کھیت نیلام ہونے لگے۔ حشمت خاں کا دوسرا لڑکا اور داماد قتل کے معاملے میں پھنس گئے۔ لڑکی نے پریشان ہو کر کنویں میں کود کر خودکشی کر لی۔ زمین کے کاغذات پر جعلی دستخط کرنے کے جرم میں نیائے دھیش نے حشمت خاں کو گرفتار کرنے اور شہر میں ہتھکڑی لگا کر گھمانے کا حکم دیا۔ جب پولس ہتھکڑی لگا کر شہر کی سڑکوں سے اسے لے جا رہی تھی تو ایک چوراہے پر کھڑا ماما پنجابی اپنے پاس کھڑے آدمی سے کہہ رہا تھا:

''مالک کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں، جو انصاف اس کے یہاں ہوتا ہے کہیں اور نہیں ہوتا۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے لیکن جسے بھی یہ لاٹھی پڑتی ہے وہ جسم سے روح تک بلبلاتا اور کانپتا رہ جاتا ہے۔''

حشمت خاں کی نظریں جب ماما پنجابی سے ٹکرائیں تو اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پچیس ہزار روپے کے نوٹ گھومتے دکھائی دینے لگے۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک لمحے کے لیے رکا ہی تھا کہ پولس والے نے ایک لات پیچھے سے مارتے ہوئے آگے چلنے کے لیے کہا۔

☆☆

علیم طاہر

تجزیہ — خدا کی قسم

دنیائے اُردو ادب میں ابراہیم اشکؔ وہ ہشت پہلو فنکار ہیں جن پر دیگر فنکاروں کا رشک کرنا بالکل فطری عمل ہے۔ وہ ایک شاعر، نقاد، محقق ہی نہیں بلکہ افسانہ نگار بھی ہیں۔

یوں تو ان کا ہر افسانہ اپنے اندر لامتناہی گہرائیاں، خوشگوار پیغامات اور دِلوں کو چھو جانے والی سچائیاں رکھتا ہے، لیکن ہم اِس وقت افسانہ ''خدا کی قسم'' کا جائزہ لیتے ہیں کہ ابراہیم اشکؔ نے اِس افسانے میں کس طرح سچائیوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک غیر مسلم کا خدا پر پختہ اعتماد ہوتا ہے بنسبت ایک نام نہاد مسلم کے، یہ اجاگر کرنے کی نہایت کامیاب کاوش کی ہے۔ ساتھ ہی اِس افسانے میں خدا کی جھوٹی قسم کھانے کے بعد قہرِ الٰہی سے بچنا ناممکن ہو جاتا ہے اور خدا کی لاٹھی جو بے آواز ہوتی ہے بلبلانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

سماج میں سچائی کا پیغام پہنچتا ہے۔ جو جھوٹ پر کرارا وار قرار دیا جا سکتا ہے۔

افسانے کے دو اہم کردار ماما پنجابی اور حشمت خاں ہیں۔ ماما پنجابی نہایت خود پرست آدمی دکھایا گیا ہے۔ جو لوگوں کو سود پر روپے دیتا تھا۔ اور سود کی رقم پانچ سے دس فیصد ہوتی تھی ضرورت مند لوگ روپے لیتے ضرور مگر سود میں اضافے کے خوف سے جلد لوٹانے میں عافیت جانتے تھے۔

ماما پنجابی کو خدا کے بعد ملک کے قانون پر مکمل اعتماد تھا اور یہی سبب تھا کہ وہ شہر کے منشی مرلی منوہر سے پرامیسری نوٹ لین دار کے نام لکھوا کر دو گواہوں کے دستخط کروانا کبھی نہیں بھولتا تھا۔

ماما پنجابی سوشل ورکر کی طرح ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ سود پر روپے لینے والے شہر کے لوگوں کے علاوہ آس پاس کے گاؤں کھیڑے کے لوگ بھی شمولیت اختیار کر چکے تھے۔ ہر کوئی ماما پنجابی کا احترام کرتا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتا لوگ قدم قدم پر اسے ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے۔ چناؤ آتے تو سیاسی لیڈر ماما کی مقبولیت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ ماما پنجابی کے ایک اشارے پر چناؤ کا پانسہ

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

پلٹ جاتا۔ اُمیدوار وہی جیتتا جس کی سفارش ماما پنجابی کرتا تھا۔

ابراہیم اشک نے ماما پنجابی کے منفی عمل کو بھی پیش کیا ہے جس میں سود پر روپے دینا شامل ہے۔ مگر اُس ہر دلعزیزی کو بھی اُجاگر کیا ہے جو دوسروں کی ضرورت (بھلے ہی سود پر کیوں نہ ہوں) پوری کرنے کے بعد سماج میں حاصل ہو جاتی ہے۔

دوسرا کردار ''حشمت خاں'' کا ہے۔ حشمت خاں شہر کے کچھ دوری پر بسے رسول گڑھ گاؤں کے پٹیل تھے۔ اپنے گاؤں میں اُن کا بڑا دبدبہ تھا۔ اِسی دبدبے کی وجہ سے انہوں نے کئی چھوٹے کسانوں اور دلت لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ آئے دن ان لوگوں کی دعوتیں حشمت خاں کے بنگلے پر ہوتی تھیں۔ سال میں دو تین بار ایسا بھی ہوتا کہ اپنے عزیز رشتہ دار کی شادی یا اپنے جنم دن کی پارٹی میں اجین کے کوٹھے کی طوائفوں کو وہ اپنی محفل رنگین بنانے کے لیے بلاتے۔ ایسے موقعوں پر دو تین دنوں تک ساری ساری رات ناچ گانا ہوتا جس میں سرکاری افسروں اور شہر کے رئیسوں کی بھیڑ جمع رہتی۔ ایسی محفلوں میں شامل ہونے کے لیے حشمت خاں ماما پنجابی کو بھی خاص طور سے دعوت دیتے، لیکن وہ ایسی کسی محفل میں آج تک شامل نہیں ہوا تھا۔ حشمت خاں کا لین دین بھی اکثر ماما پنجابی کے ساتھ ہوتا رہتا تھا۔

اِس پیراگراف میں حشمت خاں کا کردار نمودار ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ ماما پنجابی سے تعلقات کی خوشگواری بھی ظاہر ہوتی ہے مگر دعوت دینے کے بعد بھی رنگ رلیوں والی محفلوں میں ماما پنجابی کا شریک نہ ہونا اُس کے محتاط اور پرہیز گار مزاج کی شناخت کرواتا ہے اور حشمت خاں کے دبدبے سے کئی چھوٹے کسانوں اور دلت لوگوں کی زمینوں پر ناجائز قبضہ کر لینے کا مزاج حشمت خاں کے منفی رجحانات کو بیان کرتا:

'اس بار ماما پنجابی سے حشمت خاں نے پچیس ہزار روپے اُدھار لیے تھے۔ ایک مہینے کے اندر رقم واپس لوٹانے کا وعدہ کیا تھا لیکن مہینہ پورا ہو جانے کے باوجود حشمت خاں نے اب تک یہ رقم نہیں لوٹائی تھی۔ نہ ہی اِس درمیان ماما کی ملاقات ہی اس سے ہوئی تھی۔ ڈر اِس بات کا تھا کہ اِس لین دین کی لکھا پڑھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ اِس روز حشمت خاں ماما پنجابی کو ڈھونڈتا ہوا اس کے گھر جیپ لے کر رات کو دس بجے پہنچا تھا۔ اور پچیس ہزار روپے اُدھار مانگے تھے۔ ماما دن بھر کا تھکا ہوا تھا اسے نیند آ رہی تھی۔ ایسی حالت میں منشی مرلی منوہر کے گھر جا کر پرامیسری نوٹ لکھانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ پھر حشمت خاں کے ساتھ کئی بار وہ لین دین کا بیوپار کر چکا تھا اور اس نے اسے کھرا پایا تھا، ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ماما نے اُسے

روپے دے دیئے تھے۔''

ماما پنجابی کی ہمدردی اس پیراگراف میں اُجاگر ہوتی ہے کہ وہ حشمت خاں کی عزت کرتے ہوئے اپنے اُصولوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ یعنی لکھا پڑھی بھی نہیں کرتا اور پچھلے ریکارڈ کے تحت حشمت خاں کو پچیس ہزار روپے دے دیتا ہے اور روپے دیتے ہوئے کہتا ہے:

''پٹیل صاحب بغیر لکھا پڑھی کے آپ کو میں یہ پچیس ہزار روپے دے رہا ہوں۔ نہ گواہ ہے نہ کوئی ثبوت۔ اِس لین دین کو دیکھنے والا صرف خدا ہے اسی کے بھروسے میں یہ کام کر رہا ہوں۔''

ماما پنجابی کا اعتماد دیکھئے کہ وہ خدا کے بھروسے حشمت خاں کو بغیر گواہ وثبوت کے پچیس ہزار روپے دے دیتا ہے۔ اور کوئی لکھا پڑھی بھی نہیں کرتا۔ حشمت خاں نے بھی کہا تھا کہ ''ماما آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایک مہینے کے اندر اندر میں آپ کی رقم لوٹا دوں گا۔''

لین دین ہو چکا۔ نہ کوئی ثبوت نہ گواہ۔ مگر خدا کے بھروسے یہ لیکن دین اس افسانے کا اہم موڑ قرار دیا جا سکتا ہے:

''مہینہ پورا ہو گیا تو ماما کی فکر بڑھنے لگی۔ وہ حشمت خاں سے مل کر اپنی رقم واپس لینے کے لیے پریشان ہونے لگا۔ ایک دن ماما شہر کے چوراہے پر کھڑا تھا کہ اس نے دیکھا سامنے سے حشمت خاں کی جیپ چلی آ رہی ہے۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے جیپ کو روکنا چاہا لیکن وہ نہیں رکی۔ آگے بڑھ گئی۔ ماما پنجابی نے پیچھے سے بار بار حشمت خاں کو آواز لگائی لیکن حشمت خاں نے اُس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ ماما پنجابی کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ حشمت خاں کے دل میں بے ایمانی آ گئی ہے۔''

ابراہیم اشک نے افسانے کو اس فنکاری سے قلمبند کیا ہے کہ کہیں بھی مصنوعی پن نہیں جھلکتا ہے بلکہ فطری روانی کی سحر انگیزی سر چڑھ کر بولتی ہے۔ آنکھوں میں مناظر چھانے لگتے ہیں۔ جیسے کسی فلم کو اسکرین پر دیکھا جا رہا ہو۔ یہ فن لفظیات کی برجستگی، ذخیرۂ الفاظ کی لامحدودیت، استطاعتِ الفاظ کے مطابق فنکار کے برتنے کی ہنری مندی کا مظاہرہ کرتا ہے:

> ''ماما پنجابی جلد سے جلد حشمت خاں سے ملنا چاہتا تھا۔ شہر سے رسول گڑھ دو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس نے ایک کرائے کی سائیکل لی اور چل پڑا۔ بہت دنوں بعد وہ سائیکل چلا رہا تھا۔ پانچ دس منٹ اسے ذرا اٹپٹا لگا پھر سڑک پر اس کی سائیکل آرام سے دوڑنے لگی۔ دن کے بارہ بجے تھے جب وہ حشمت کے

گھر پہنچا۔ حشمت خاں اندر کے کمرے میں تھا۔ گھر کے نوکر نے اندر جا کر اسے بتایا کہ ماما پنجابی اسے ملنے آیا ہے۔ حشمت نے اسے کمرے میں بٹھانے اور چائے پانی پلانے کا (نوکر کو) حکم دیا۔ ماما پنجابی بیٹھک میں بیٹھا حشمت خاں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا ایک ایک پل کسی انتظار بھری صدی سے کم نہیں تھا۔''

ابراہیم اشک نے ماما پنجابی کی بیتابی و بے قراری کی دلآویز منظر کشی کی ہے۔ اُنہیں انسانی نفسیات پر کافی عبور ہے۔ جب ماما پنجابی کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ حشمت خاں اُس کے پچیس ہزار ہڑپ لینا چاہتا ہے تب فطری طور پر اُس کا بے اطمینانی کا شکار ہونا لازمی ہے مگر جس حسن خوبی سے اِس منظر کو ابراہیم اشک نے قلمبند کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''گرودوارے سے نکل کر وہ روزانہ کی طرح سیفی ہوٹل پر ناشتہ کرنے گیا۔ آج اسے قیمہ اور ڈبل روٹی بے مزہ لگ رہے تھے۔ اِس نے آدھا کھایا اور آدھا یونہی چھوڑ دیا۔ چائے بھی آج اچھی نہیں لگ رہی تھی ہر گھونٹ اِسے زہر کے گھونٹ کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ کاؤنٹر پر جب وہ بل دینے لگا تو ہوٹل والے سے شکایت کرنے لگا کہ آج کل تمہارے یہاں قیمہ اچھا بنتا ہے نہ چاہئے ہی مزیدار ہے۔ سب بیکار ہے بکواس ہے۔''

اِس پیراگرف میں ماما پنجابی کی جھلاہٹ انسانی نفسیات کے عین مطابق نہایت انتشاری تاثرات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جس سے فنکار کے نفسیاتی عبور کا ثبوت فراہم ہوتا ہے:

''ماما پنجابی آدھا گھنٹہ جل بھُن کر کباب بنتا رہا۔ تب کہیں جا کر حشمت بیٹھک میں آیا۔ آتے ہی اس نے بڑی گرمجوشی سے ماما پنجابی کو گلے لگایا اور پھر انجان بن کر پوچھنے لگا:

''کیسے آنا ہوا ماما جی؟ کیا گاؤں میں کسی سے وصولی کرنا ہے۔''

''ہاں پٹیل صاحب! وصولی کے لیے ہی آیا ہوں۔'' ماما پنجابی نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''تو ہو گئی صولی؟'' وہ مسکرایا۔

''نہیں، ابھی کہاں ہوئی۔'' ماما نے کہا۔

''تو پھر کر لیجئے وصولی اور دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایئے۔ کون آدمی ہے؟ کتنے روپے دیے ہیں؟ اگر میری ضرورت ہو تو چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔'' حشمت نے بات بناتے ہوئے کہا۔

''وصولی تو آپ سے ہی کرنا ہے پٹیل صاحب! وہ پچیس ہزار روپے جو میں نے آپ کو دیئے تھے۔'' ماما نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

''حشمت خاں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ واہ! ماما جی واہ! بہت اچھا مذاق کر لیتے ہیں آپ بھی۔ میں اور پچیس ہزار روپے آپ سے کیوں لوں گا بھلا؟ میرے پاس کس بات کی کمی ہے۔''

''مذاق تو آپ کر رہے ہیں پٹیل صاحب۔ اچھا ہوتا میں لکھا پڑھی کر لیتا تو یہ نوبت ہی نہیں آتی۔ میں نے آپ پر بھروسہ کیا آپ کو عزت دی اُس کا یہ صلہ ملے گا میں نے کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا۔'' وہ نراش ہو کر بولا۔

''دیکھئے آپ ایک شریف آدمی کے گھر میں بیٹھ کر اس پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں۔ میں چاہوں تو ابھی آپ کو دھکے مار کر باہر نکال سکتا ہوں، لیکن میں ضبط کر رہا ہوں۔''

ابراہیم اشک نے مکالموں کے ذریعے انسانی نیتوں کے بدلاؤ کو شرانگیزی سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ جب اُس پر شر غالب آتا ہے تو وہ اِس قسم کی گفتگو کرنے لگتا ہے۔ وعدہ خلافی اس کے لئے معمولی بات ہو جاتی ہے۔ مگر وہیں ماما پنجابی کے ذریعہ خدا پر اعتماد کا نادر مظاہرہ بھی ہوتا ہے جبکہ وہ مسلم نہیں ہے:

''اِس میں مکرنے کی کیا بات ہے ماما جی! آپ پچیس ہزار روپے کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے تو آپ سے پچیس پیسے بھی نہیں لیے ہیں۔'' حشمت خاں نے زور دے کر کہا۔

''یہی بات آپ مسجد میں قرآن اُٹھا کر کہہ دیں پٹیل صاحب! میں خدا کے نام پر پچیس ہزار روپے بھول جاؤں گا۔'' ماما پنجابی نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس اتنی سی بات ہے! ماما جی میں مسجد میں قرآن اُٹھا کر بھی یہ بات کہہ سکتا ہوں۔ سانچ کو آنچ کیا۔'' حشمت خاں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

ماما جی کو خدا پر بھروسہ تھا۔ انہوں نے گاؤں کے پانچ آدمیوں کو اکٹھا کیا اور حشمت خاں کو ساتھ لے کر گاؤں کی مسجد میں گئے جہاں حشمت خاں نے وضو کر قرآن ہاتھوں میں لے کر کہا ''میں پاک پروردگار کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ماما پنجابی سے پچیس ہزار روپے اُدھار نہیں لیے۔''

افسانے کا نقطۂ عروج یہیں پر اُجاگر ہوتا ہے کہ ایمان والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ حشمت خاں قابلِ نفرت کردار نظر آتا ہے:

''ماما کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کیا تھا۔ اب وہی

انصاف کرنے والا تھا۔ مسجد سے نکلتے وقت حشمت خاں نے جب ماما سے گھر چل کر دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا ''تمہارے گھر کا تو پانی پینا بھی میرے لیے حرام ہے پٹیل صاحب! خدا کی ذات کو آپ نے سمجھا ہی نہیں محض پچیس ہزار روپے کے لیے آپ اس کی جھوٹی قسم کھا گئے۔ اس کا عذاب تم پر ایسا نازل ہوگا کہ تمہیں کوئی پناہ دینے والا نہیں ملے گا۔''

ماما نے اپنی سائیکل اٹھائی اور شہر کی طرف چل دیا۔

ابراہیم اشک نے سماج کی اُس دکھتی نبض پر ہاتھ رکھا ہے جسے جانتے ہوئے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ نہ حشمت خاں جیسے افراد کی سماج میں کوئی کمی ہے اور نہ ہی ماما پنجابی جیسے افراد کی۔

مگر افسانے کا اختتام دیکھئے کس قدر دل دہلا دینے والا ہے جس کے ذریعے سماج میں جھوٹی قسم کھانے سے بچنے اور جھوٹ نہ بولنے کا گہرا تاثر اور پیغام پہنچتا ہے۔

''اِس واقعہ کو سال بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ حشمت خاں کے بیس سالہ جوان بیٹے کو ایک دن جنگل میں سانپ نے ڈس لیا اور اس کی وہیں موت ہوگئی۔ دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ حشمت خاں کی بیوی جوان بیٹے کے غم اور ٹی بی کی بیماری سے مرگئی۔ کنوؤں کا پانی سوکھ گیا۔ فصلیں چوپٹ ہونے لگیں۔ بینکوں کے قرض اتنے بڑھ گئے کہ کھیت نیلام ہونے لگے۔ حشمت خاں کا دوسرا لڑکا اور داماد قتل کے معاملے میں پھنس گئے۔ لڑکی نے پریشان ہوکر کنویں میں کود کر خودکشی کرلی۔ زمین کے کاغذات پر جعلی دستخط کرنے کے جرم میں نیائے دھیش نے حشمت خاں کو گرفتار کرنے اور شہر میں ہتھکڑی لگا کر گھمانے کا حکم دیا۔''

خدا کے اُصول وضوابط، آئین وقوانین اپنی جگہ اٹل ہوتے ہیں۔ جھوٹی قسم کھانے کے بعد سزاؤں کا بھگتان بھگتنا لازمی ہے۔ قہرِ الٰہی کے نزول کے بعد پچھتاوے اور شرمندگی کے سوا کچھ نہیں بچتا ہے وہ بھی دیر ہو چکنے کے بعد رائیگاں ثابت ہوتی ہے:

''جب پولس ہتھکڑی لگا کر شہر کی سڑکوں سے اسے لے جارہی تھی تو ایک چوراہے پر کھڑا ماما پنجابی اپنے پاس کھڑے آدمی سے کہہ رہا تھا:

''مالک کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں، جو انصاف اس کے ہاں ہوتا ہے۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے لیکن جسے بھی یہ لاٹھی پڑتی ہے وہ جسم سے روح تک بلبلاتا اور کانپتا رہ جاتا ہے۔''

''حشمت خاں کی نظریں جب ماما پنجابی سے ٹکرائیں تو اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پچیس ہزار روپے کے نوٹ گھومتے دکھائی دینے لگے۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک لمحے کے لئے رکا ہی تھا کہ پولس والے نے ایک لات پیچھے سے مارتے ہوئے آگے چلنے کے لیے کہا۔''

نفرت ونفاق کے عفریت کو ختم کرنے کے لئے ''ہم'' ہی پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ یہاں ''ہم'' سے میری مراد۔ ''ہ'' سے ہندو اور ''م'' سے مسلمان ہے! یہ کہانی ہمیں کچھ سوچنے، غور کرنے اور اس منافرت کی مسموم فضا کی دہشت ناکی سے تدارک اور تدبّر کی ترغیب بھی دیتی ہے۔ اشک صاحب کی اس کہانی میں جدّت بھی ہے، جسارت بھی، اور جستجو بھی! ان کا یہ مثلّث ندرت کا ضامن ہے! ان کا پلاٹ چُست، جملوں کی ساخت درست اور لفظوں کا استعمال برمحل ہے۔

ابراہیم اشک کو کہانی کی تکنیک اور افسانے کے شعور کی گہری واقفیت ہے، انھیں اس کا بھی علم وعرفان ہے کہ افسانے میں پلاٹ اور کردار سازی کے علاوہ زبان اور اسلوب کی اہمیت ناگزیر ہوتی ہے۔ ابراہیم اشک کی ایک اور خوبی جو راقم کی نظر میں محبوبی بھی ہے یہ کہ انھوں نے اپنے اس سادہ وشفّاف بیانیے میں زمین وآسمان کے قلابے نہیں ملائے، نہ ہی دقیق جملوں کے قطب مینار کھڑے کئے، نہ ہی کوئی فلسفہ بگھارا، صرف سلیس وسادہ جَتنا کی زبان میں اپنی کہانی کو پیش کیا ہے، جو دل کو لُبھاتی، دماغ کو گرماتی اور روح کو برماتی ہے! مجھے مسرت ہے کہ ابراہیم اشک نے اپنے افسانے میں بے معنی لفظوں اور بے پر کے جملوں کے لاطائل گورکھ دھندے سے کام نہیں لیا بلکہ سہل وسلیس، سادہ نفیس اور آسان زبان کو پیش نگاہ رکھا ہے۔ بہرنوع صنفِ افسانہ کے آہوئے چشم کے گرفتاروں میں ابراہیم اشک بھی شامل ہو چکے ہیں، بابری مسجد کی شہادت، مندر و مسجد کی سیاست، مسلمانوں کی ہلاکت اور فرقہ پرستی وفاشزم کا جو خون آشام کھیل، عرصہ سے کھیلا جارہا ہے، اس سیاق میں ''دھندہ'' کا جواز تلاشا جاسکتا ہے۔

محولہ تمام خوبیوں کے باوجود ''دھندہ'' کے ذیل میں کچھ تسامح کی جانب اشارہ کرنا بھی ضروری ہے مثلاً ابراہیم اشک نے اپنے دونوں کرداروں کو مختصر ترین عرصہ میں بے نہایت دولت، شہرت، منصب کے کوہِ گراں پر چڑھا ہوا دکھایا ہے جب کہ اصلی وحقیقی زندگی میں آج کے عوام اتنے بھی احمق اور سادہ لوح نہیں کہ وہ دونوں کرداروں کے بہکاوے میں آکر مندر و مسجد کے لئے چندہ اکٹھا کرنے میں اتنی عجلت اور دریا دلی دکھائیں اور دونوں نام نہاد لیڈری میں اتنا مقام حاصل کرلیں اور نہ صرف ارکانِ پارلیمان بلکہ کرسیٔ وزارت پر بھی قابض ہوجائیں، اسی طرح قدیم قبرستان اور ویران مندر کی تعمیر کے لئے زرِ کثیر اکٹھا کرلیں اور ان تمام کارروائیوں سے افسران اور حکومت، خواب خرگوش میں مگن رہیں۔

اسی طرح جہاں تک چونکانے، تحیّر اور تجسّس میں قاری کو مبتلا کردینے کا معاملہ ہے، ''دھندہ'' میں یہ کیفیت مفقود ہے، گرچہ کہانی میں ''کہانی پن'' ہے تاہم حیرت واستعجاب والی کیفیت

افسانہ کا اختتام یہیں ہوتا ہے۔

ابراہیم اشک نے ابتداء سے افسانوں کی فضا میں وہ حقیقی رنگ بکھیرے ہیں کہ پڑھنے والا ختم کئے بغیر دم نہیں لیتا اور اُسے افسوس ہوتا ہے کہ یہ ختم کیوں ہو گیا۔ مزید مطالعہ کی تشنگی قارئین کو افسانوں کی اہمیت وافادیت کا احساس دلاتی ہے۔

''خدا کی قسم'' افسانہ میں انسانی زندگی کے حقیقی پہلوؤں پر تیز روشنی پڑتی ہے۔ منفی مثبت رجحانات کے خوشگوار اور بدترین نتائج کی برآمدگی شر پسندوں کو خوفزدہ گی میں مبتلا کر کے شر پسندی کی روک تھام کے ساتھ ساتھ ہمدرد اور بھلے انسانوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے۔

بالخصوص اِس افسانے میں ایک غیر مسلم کو خدا پر کتنا اعتماد ہے اور ایک مسلم کا کتنا کمزور عقیدہ ہے یہ واضح کیا گیا ہے۔

ساتھ ہی جھوٹی قسم نہیں کھانی چاہئے یہ سراسر نقصان دہ ہی نہیں بلکہ قہر الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ یہ پیغام تحفظ سماج تک رسائی پاتا ہے۔ جو سچ بولنے، سچائی کو عام کرنے اور سچائی پر اعتماد کرنے پر زور دیتا ہے۔ اور اگر حق بولیں تو سچائی کا دوسرا نام ہی خدا ہے۔

House No. 51, Sarvey No. 19
Momin Pura, Malegaon- 423203 (Nasik)

☆☆

رام جی کا دُکھ

صدیوں تک سُورگ میں رہتے رہتے رام چندر جی کا من اکتانے لگا، انہوں نے اپنے سیوک بجرنگ بلی کو آدیش دیا'' ہمارے لیے فوراً رتھ کا پربندھ کرو ہم مرتیولوک کی یاترا پر جائیں گے۔'' بجرنگ بلی نے ہاتھ جوڑ کر کہا'' جو آگیا بھگوان'' اور رتھ کا پربندھ کرنے چلے گئے۔ کچھ ہی دیر میں ایک رتھ لے کر بجرنگ بلی رام چندر جی کی سیوا میں اُپستھت ہو گئے۔ کسی طرح سیتا جی کو اس کی بھنک لگ گئی اور وہ بھی دوڑی دوڑی رام چندر جی کے پاس آگئی اور مرتیولوک کی سیر کرنے کے لیے ان کے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگی۔ انہیں بڑے پیار سے رام چندر جی نے سمجھایا اور کہا'' اس سمئے مرتیولوک کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ کوئی سبھیہ پُروش اپنی پتنی کے ساتھ سُکھ شانتی سے وہاں گھوم پھر سکے۔ گلی گلی میں آتنک اور نفرت کی کالی چھایا منڈلا رہی ہے، مہیلاؤں کی عزت آبرو خطرے میں ہے۔ ایسی حالت میں ہم کوئی بھی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ پرستھتیاں سامانیہ ہونے پر ہم جلد ہی آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اس بات کا وچن دیتے ہیں۔''

سیتا جی عام عورتوں کی طرح تو تھی نہیں جو اپنے پتی کی چنتا اور پریشانی کا کارن بنتی لیکن اتنا تو انہوں نے پوچھ ہی لیا'' کیا وہاں کی پرستھتیاں جنگلوں سے بھی زیادہ خراب ہو گئی ہیں؟ میں نے تو آپ کے ساتھ چودہ برس کا بنباس، جنگلوں، کندراؤں اور گپھاؤں میں بتایا تھا۔''

رام جی نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا'' واستو میں یہ کلیگ ہے۔ اس یُگ کا آدمی جنگلی جانوروں سے بھی ادھک ہنسک اور اَتیاچاری ہو گیا ہے۔ اُس سمئے جب تم ہمارے ساتھ جنگلوں میں چودہ برس کا بنواس کاٹ رہی تھی تو ساری دنیا میں صرف ایک ہی راون تھا۔ لیکن ان دنوں گلی گلی اور شہر شہر میں کئی راون پیدا ہو گئے ہیں۔ پہلے راون صرف ایک چھوٹی سی لنکا پر راج کرتا تھا اب تو امریکہ، انگلینڈ، آسٹریلیا جیسے بڑے بڑے دیشوں پر بڑے بڑے راونوں کا راج ہو گیا ہے۔ سمست سنسار کی مانوتا ان کے کارن خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ہم جلد ہی سمست پرستھتیوں کا نرکشن کر کے لوٹیں گے اور پھر تمہیں بھی اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔'' سیتا جی نے رام چندر جی

کی بات مان لی اور وہ بجرنگ بلی کے ساتھ مرتیولوک کی طرف چل پڑے۔

مرتیولوک میں جہاں ان کا رتھ اترا انہوں نے دیکھا ہر طرف مارلوٹ مچی ہوئی ہے۔ سڑکوں پر اِدھر اُدھر لاشیں بچھی ہوئی ہیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ کچھ لوگ ماں، بہن، بیٹیوں کی عزت سے کھلواڑ کر رہے ہیں۔ معصوم بچوں کو سنگینوں پر اچھالا اور جلتی ہوئی آگ کے شعلوں میں پھینکا جا رہا ہے۔ یہ سب رام چندر جی سے دیکھا نہیں گیا۔ مارے شرم کے انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپالیا۔ ان کا جی بھر آیا اور آنکھوں سے اشکِ ودھارا بہنے لگی۔ کئی صدیوں کے بعد انہیں اس طرح روتے ہوئے دیکھ کر بجرنگ بلی بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ بڑی دیر کے بعد دونوں کے من کا غبار چھٹا اور جب وہ چُپ ہوئے تو ان کے کانوں میں ''جئے شری رام'' کے نعروں کا شور گونجنے لگا۔

شری رام چندر جی نے بجرنگ بلی سے کہا رتھ اُدھر لے چلو جدھر یہ شور بلند ہو رہا ہے۔ انہوں نے آدیش کا پالن کیا۔ کچھ ہی دور جانے پر ایک بھیانک منظر دونوں نے دیکھا۔ ہزاروں لوگ پاگلوں کی طرح ہاتھوں میں دھاردار ہتھیار لیے نشے میں جھوم رہے تھے اور ناچ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر راکشسوں جیسی مسکراہٹ تھی۔

شری رام نے بجرنگ بلی سے پوچھا ''یہ کون لوگ ہیں اور اس طرح کس بات کا جشن منا رہے ہیں؟''

بجرنگ بلی نے جواب دیا ''یہ سب راکشس ہیں۔ راون کی نیتیوں میں بسواس کرنے والے۔ سنسار میں جہاں کہیں بھی سچائی، شانتی، اہنسا اور مانوتا دیکھتے ہیں یہ اسے مٹانے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں اور جب مانوتا کی ہتیا ہو جاتی ہے یہ اسی طرح شراب پی کر ناچتے گاتے ہیں۔''

''لیکن یہ تو جئے شری رام کے نعرے بھی لگا رہے ہیں جب کہ میرے آدرشوں کو تو یہ پاؤں تلے روندرہے ہیں۔ انہیں تو راون کے نام کے نعرے لگانا چاہئے۔ میں ابھی جا کر انہیں کہتا ہوں کہ اس طرح میرے نام کو بدنام نہ کریں۔'' رام جی رتھ سے اترنے لگے تو بجرنگ بلی نے ان کے پاؤں پکڑ لیے اور بنتی کرنے لگے:

''بھگوان۔ آپ ان کے بیچ نہ جائیں۔ یہ نہیں جانتے کہ آپ کی مان مریادہ کیا ہے۔ اگر آپ نے اپنا پریچے دیا تو یہ اگیانی آپ کی ہنسی اڑائیں گے۔ آپ کا اپمان کریں گے اور ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ آپ کو جو بھی تماشا دکھائی دے اسے خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہئے۔ میں آپ کو رتھ سے نیچے نہیں اترنے دوں گا۔'' بجرنگ بلی ہاتھ جوڑ کر بولے۔

رام جی نے اپنے سیوک کی بات مان لی اور رتھ میں بیٹھ گئے۔ پھر بجرنگ بلی کو آدیش دیا ''کہیں اور چلو۔ اب یہاں ایک پل کے لیے بھی ٹھہرنا میرے لیے کشٹ دایک ہے۔''

بجرنگ بلی نے وہاں سے رتھ آگے بڑھا دیا۔ ابھی کچھ ہی دور نکلے تھے کہ راستے میں ایک جگہ ہزاروں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی آنے جانے کے سارے راستے بند تھے۔ لوگ کافی پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ منچ پر ایک آدمی پاگلوں کی طرح زور زور سے چلاّ رہا تھا۔ اس کے آس پاس ہتھیاروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ ہتھیار وہ عام لوگوں میں بانٹ رہا تھا اور جے شری رام کے نعرے لگا رہا تھا۔ رام چندر جی نے اس بدحواس کو دیکھا تو اپنے داس بجرنگ بلی سے پوچھا "یہ کون پاگل ہے۔ اور کیا تماشا کر رہا ہے۔"

بجرنگ بلی بتانے لگے "بچپن میں یہ بڑے ہی شانت سو بھاؤ کا تھا۔ نہ کسی سے لڑائی نہ جھگڑا بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور پڑھنے لکھنے میں مگن رہتا تھا۔ ہونہار وِدیارتھی تھا لیکن دربھاگیہ سے ایک ایسی سنستھا کے سمپرک میں آ گیا جو لوگوں کے مستشک کو وِکرُت بنانے میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتی ہے۔ کئی سال تک اس سنستھا کے سمپرک میں رہنے سے اس کا دماغ اتنا وِکرت ہو گیا ہے کہ اسے سپنے میں بھی مار کاٹ، خون خرابہ، اتیاچار اور آتنگ کے درشیہ دکھائی دیتے ہیں اور سارے سنسار کو اشانت کرنے کے لیے یہ ہتھیار بانٹتا پھرتا ہے۔"

"لیکن رام کے نام پر یہ ہتھیار کیوں بانٹے جا رہے ہیں جب کہ میں نے تو ایسے ہتھیار کبھی ہاتھ میں اٹھائے بھی نہیں ہیں۔ میرے ہاتھ میں تو ہمیشہ دَھنش بان ہی دکھائی دیے ہیں۔ اس پاگل سے کہہ دو اگر اسے ہتھیار ہی بانٹنا ہے تو راون کے نام پر بانٹے رام کے نام کو بدنام نہ کرے۔ میں نے تو سنسار کو شانتی اور سدبھاؤنا کا سندیش دیا ہے آتنگ اور اشانتی کا نہیں۔"

یہ سب منظر دیکھ دیکھ کر رام چندر جی کا من کافی دکھی ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے اس سے تو اچھا تھا وہیں سورگ لوک میں رہتا۔ نہ مرتیو لوک میں آتا نہ ایسے بھیانک درشیہ دیکھنے کو ملتے۔ اب وہ جلد سے جلد واپس سورگ لوک لوٹ جانا چاہتے تھے لیکن اپنی ایودھیا نگری دیکھے بغیر وہ کیسے واپس چلے جاتے؟ انہوں نے بجرنگ بلی کو رتھ لے کر ایودھیا چلنے کا آدیش دیا۔ بجرنگ بلی نے رتھ کو اَیودھیا کی طرف موڑ دیا۔

راستے میں ایک جگہ بڑا سا ہنومان مندر آیا جہاں لوگوں کی بھیڑ جٹی ہوئی تھی۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ترشول، بلّم، بھالے اور تلواریں تھیں۔ سب جئے بجرنگ بلی کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ سب بجرنگ بلی کا جنم دن منانے کے بہانے اکٹھا ہوئے تھے۔ اس موقع پر دل کے آکار کا ایک خوبصورت کیک بھی بنایا گیا تھا۔ جس پر ہری، لال، پیلی اور نیلی موم بتیاں بھی روشن ہو رہی تھیں۔ رام چندر جی نے جب یہ نظارہ دیکھا تو مسکرا کر بجرنگ بلی سے بولے "آج کل تمہارے بھگت بڑے آدھونک ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو تمہارا جنم دن بھی انگریزی اسٹائل میں منایا جا رہا ہے؟"

بجرنگ بلی کافی دکھی تھے۔ کہنے لگے" اپنے بھگتوں کے آتنک اور امانویہ کاریوں سے میرا نام بہت بدنام ہو چکا ہے پربھو! اور اب تو انگریزی اسٹائل میں کیک کاٹ کر میرے جنم دن منانے کی رسم کے دوارا انہوں نے میرا مذاق اڑانا بھی شروع کر دیا ہے۔ آپ ہی انہیں سَد بُدھی دیں تا کہ آپ کے سیوک کا مان سمان بنا رہے۔"

رام چندر جی نے کہا" جن کی بُدھی بھرشٹ ہو چکی ہو ان کے لے سَد بدھی کی پرارتھنا نرارتھک ہے۔ چلو ایودھیا چلو۔"

بجرنگ بلی نے رتھ ایودھیا کی طرف موڑ دیا۔ شہر میں پہنچے تو ہر طرف سناٹا تھا۔ ہر طرف جیسے ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ زندہ ضرور تھے مگر مردوں کی طرح چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ صدیوں بعد انہوں نے ایودھیا کو اس حال میں دیکھا تو ان کا دل بجھ سا گیا۔ وہ کافی دکھی ہوئے۔ اچانک ان کا رتھ وہاں پہنچا جہاں کچھ برسوں پہلے بابری مسجد تھی اور جسے گرا کر لمبے سنگھرش کے بعد وہاں ایک عالیشان رام مندر بنا دیا گیا تھا۔

بجرنگ بلی نے رتھ روک دیا تھا اور اب وہ دونوں عالیشان رام مندر کو دیکھ رہے تھے۔ سب سے پہلے ان کی نظریں مندر کی بنیاد پر پڑیں۔ انہوں نے دیکھا کئی نرکنکال، کھوپڑیاں اور مانس کے لوتھڑے اس میں دبے پڑے تھے۔ کھمبوں اور دیواروں پر نظر پڑی تو ہر طرف کھوپڑیاں اور انسانوں کے جسم چنے ہوئے تھے۔ ان کے آس پاس خون کے ریلے اور بڑے بڑے دھبے تھے اور ان دھبّوں کے پیچھے دردناک چیخیں تھیں جو ماحول میں بار بار گونج اٹھتی تھیں۔ رام چندر جی نے بجرنگ بلی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور دھیرے سے پوچھا" کیا رام مندر ایسا ہی ہوتا ہے، بجرنگ بلی۔! جو مانویہ کھوپڑیوں، نرکنکالوں، خون کے دھبّوں اور بے گناہوں کی چیخوں سے بنتا ہے؟"

بجرنگ بلی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا" نہیں بھگوان! رام مندر تو مریادہ پُرشوتم کے آدرشوں، شردھا، سدبھاؤنا اور بسواس کے پھولوں، مانویہ مُولیوں کی خوشبوؤں سے بنتا ہے جس میں آتما کی سندرتا اور پرماتما کا واس ہوتا ہے۔"

رام چندر جی بولے" تو پھر ہمیں یہاں سے دور لے چلو۔ دور..... بہت دور....."

اور بجرنگ بلی نے رام چندر جی کے آدیش کا پالن کرتے ہوئے رتھ کو پریت دشا میں تیزی سے موڑ دیا۔ اب اُن کا رتھ مرتیولوک سے سورگ لوک کی طرف واپس جا رہا تھا۔ دونوں چپ اور دُکھی تھے۔ یہ دکھ ہر پل گہرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆

مقبول واجد

تجزیہ — رام جی کا دُکھ

'رام جی کا دُکھ' ابراہیم اشک کا ایک ایسا افسانہ ہے جو آنکھوں دیکھا سانحہ ہے اور جسے صرف لفظی جامہ پہنایا گیا ہے۔ یہ ایودھیا کے بابری مسجد کے انہدام اور اُس سے جُڑے دیگر حادثات کی سچّی کہانی ہے۔ ایسے تو یہ کہانی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا ایک عظیم سانحہ ہے، ایک کڑوا سچ ہے اور اس واقعہ کو ساری دنیا نے ایک ساتھ ٹیلی ویژن پر لائیو دیکھا ہے۔ امن وشانتی کے ملک ہندوستان کے مٹھی بھر کٹر وادیوں نے مذہب کی آڑ لے کر مریادا پُرشوتم شری رام چندر جی کے نام پر ایک تاریخی مسجد جسے عہدِ بابر میں میر باقی نے تعمیر کرایا تھا منہدم کر دیا اور بربریت کا وہ ننگا رقص پیش کیا کہ بھگوان رام کی آتما کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ اِس حادثے کی تمام دنیا نے ایک زبان سے مذمت کی پھر ہندوستان میں جگہ جگہ دھرم کے نام پر دنگے فساد ہوئے اُس میں وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ماں، بہنوں کی عصمت دری ہوئی تو معصوم بچّوں کو سنگینوں پر اُچھالا گیا، گھروں کا محاصرہ کر کے اُس میں پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی تو مسافروں سے کھچا کھچ بھری ٹرین کے ڈبّوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا، نوجوانوں اور ضعیفوں کو قتل کیا گیا تو اربوں کی ذاتی اور سرکاری ملکیت برباد کی گئی۔ اچھے خاصے ہندوستان میں جیسے بھونچال آ گیا، سرکاریں برخاست ہو گئیں تو ہندو مسلم کے بیچ ایک چوڑی کھائی کُھد گئی اور ملک کا امن وسکون تار تار ہو گیا۔

سورگ لوک میں بیٹھے شری رام چندر جی کی آتما بھی اِس حادثے سے کراہ اُٹھی اور وہ اپنے نام پر ہونے والے اِس ظلم وتشدد کو بذاتِ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے مرتیو لوک کا بھرمن کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ بقول ابراہیم اشک:

> ''اُنھوں نے اپنے سیوک بجرنگ بلی کو آدیش دیا کہ ہمارے لئے فوراً رتھ کا پربندکرو ہم مرتیو لوک کی یاترا پر جائیں گے۔ بجرنگ بلی نے ہاتھ جوڑ کر کہا جو آگیا بھگون۔ کسی طرح سیتا جی کو اس کی بھنک لگ گئی اور وہ بھی دوڑی دوڑی

رام چندر جی کے پاس آ گئیں اور مرتیولوک کی سیر کرنے کے لئے اُن کے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگیں۔ اُنھیں بڑے پیار سے رام چندر جی نے سمجھایا کہ اِس سمئے مرتیولوک کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ کوئی سبھیہ پرش اپنی پتنی کے ساتھ سکھ شانتی سے وہاں گھوم پھر سکے۔ گلی گلی میں آتنک اور نفرت کی کالی چھایا منڈلا رہی ہے۔ مہیلاؤں کی عزت آبرو خطرے میں ہے۔ ایسی حالت میں ہم کوئی بھی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ پرستھیاں سامانیہ ہونے پر ہم جلد ہی آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اِس بات کا بچن دیتے ہیں۔ سیتا جی عام عورتوں کی طرح تو تھیں نہیں جو اپنے پتی کی چنتا اور پریشانی کا کارن بنتی لیکن اِتنا تو پوچھ ہی لیا: کیا وہاں کی پرستھتیاں جنگلوں سے بھی زیادہ خراب ہوگئی ہیں؟ میں نے تو آپ کے ساتھ چودہ برس کا بنباس جنگلوں، کندراؤں اور گپھاؤں میں بتایا ہے۔ رام جی نے اُنھیں سمجھاتے ہوئے کہا واستو میں یہ کلیگ ہے۔ اِس یگ کا آدمی جانوروں سے بھی ادھک ہنسک اور اتیاچاری ہوگیا ہے۔ اُس سمئے تو ساری دنیا میں صرف ایک ہی راون تھا لیکن اِن دنوں گلی گلی اور شہر شہر میں کئی راون پیدا ہوگئے ہیں۔ پہلے راون صرف ایک چھوٹی سی لنکا پر راج کرتا تھا اب تو امریکہ، انگلینڈ، آسٹریلیا جیسے بڑے بڑے دیشوں پر بڑے بڑے راونوں کا راج ہوگیا ہے۔ سمست سنسار کی مانوتا اُن کے کارن خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ہم جلد ہی سمست پرستھتیوں کا نرکشن کر کے لوٹیں گے اور پھر تمہیں بھی اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ سیتا جی نے رام چندر جی کی بات مان لی اور وہ بجرنگ بلی کے ساتھ مرتیولوک کی طرف چل دیئے۔''

شری رام چندر جی اپنے سیوک ہنومان جی کے ساتھ مرتیولوک کا نظارہ کرنے کی غرض سے اپنے ملک ہندوستان میں وارد ہوئے ہیں اور جگہ جگہ جو خون خرابا اور ظلم وستم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اُس سے اُن کی آتما بِل اُٹھتی ہے۔ سرِ عام اپنے آدرشوں کا مذاق اُڑتے ہوئے دیکھ کر اِتنے دُکھی ہوجاتے ہیں کہ فوراً وہ سورگ لوک کو واپس ہوجاتے ہیں۔ اتنے بڑے افسانوی پلاٹ کو ابراہیم اشک صرف سوا چار صفحات میں بڑی حکمت عملی سے سمیٹ لیتے ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے کہ کبھی راہی معصوم رضا نے مہابھارت سیریئل میں سمئے (وقت) کو پرتیک بنا کر مہرشی وید ویاس کے لمبے چوڑے مہابھارت کی کتھا کو چند اِپیسوڈ میں سمیٹ لیا تھا۔ رام جی کے دُکھ میں

دو ہی خاص کردار ہیں شری رام چندر جی اور مہابلی ہنومان جی۔ اس مختصر سی کہانی میں شری رام چندر جی نے اپنے رتھ پر سوار ہو کر سمو چے ہندوستان کا بھرمن کیا اور جہاں جہاں بھی گئے اپنے نام پر اپنے آدرشوں کا اپمان ہوتے ئے دیکھا۔ سب سے پہلے اُن کا رتھ ایک ایسے شہر میں اُترتا ہے جہاں دنگے فساد اور قتل وغارت گری دیکھ کر مارے شرم کے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ اُن کے سیوک ہنومان جی بھی اپنے آپ کو روک نہیں پاتے ہیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔ پھر اُن کا رتھ ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں ایک بڑا ہجوم اپنے ہاتھوں میں تلوار، بھالا، پھرسا اور ترشول لئے ہوئے سڑکوں اور گلیوں میں جئے شری رام کا نعرہ بلند کر رہا ہے۔ لوگ ڈھول تاشے بجا بجا کر ناچ کود رہے ہیں اور معصوم شہری اپنے اپنے گھروں میں مقید امن وسکون کی دعا کر رہے ہیں کیونکہ یہ مصلح مذہبی جلوس جب جب آبادیوں سے گزرتا ہے گاؤں شہر پلک جھپکتے کھنڈر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ رام چندر جی سے اپنا اپمان دیکھا نہیں جاتا اور وہ ہنومان جی سے کہتے ہیں، لیکن یہ لوگ تو جئے شری رام کے نعرے بھی لگا رہے ہیں اور میرے آدرشوں کو پاؤں تلے روند بھی رہے ہیں۔ اِنھیں تو راون کے نام کے نعرے لگانا چاہئے۔''

اِسی طرح کے جلوس کو دیکھ کر ندا فاضلی صاحب، اپنے مضمون ''تمہیں ہندو کی چاہت ہے نہ مسلم سے عداوت ہے'' میں کچھ اس طرح تحریر کرتے ہیں:

> ''اِسی طرح جیسے فیض آباد میں مذہبی جنون کو ہوا دے کر بہت سوں کو برباد کر کے رتھ پر تلسی کے رام کو بٹھا کر مریادا پُرشوتم کی مورتی سے بچوں کو ڈرا کر، ماؤں کو رُلا کر، بستیوں میں آگ لگا کر پورے دیش کو اقلیت واکثریت کا تنازعہ بنا کر ایک لیڈر سیکولر بن کر اپنے بہت سے سوالوں کو لاجواب کئے ہوئے ہے۔''

تو پھر شری رام چندر جی کا رتھ کسی دوسری جگہ پہنچتا ہے تو دیکھا کہ ایک جگہ ہزار دو ہزار لوگوں کا مجمع بنا ہوا ہے اور ایک آدمی منچ پر کھڑا ہو کر پاگلوں کی طرح چیخ چلاّ رہا ہے اور اُس کے اِرد گرد منچ پر بے شمار ہتھیاروں کا ذخیرہ پڑا ہے اور وہ ایک ایک کر ترشول، بلّم اور تلواریں لوگوں میں بانٹ رہا ہے۔ وہ خود بھی بیچ بیچ میں جئے شری رام کے نعرے لگا رہا ہے اور پورا مجمع بھی شری رام چندر کی جئے جئے کار کر رہا ہے۔ اِس طرح سیدھے سادے لوگوں میں خطرناک ہتھیار بنتا دیکھ کر رام جی کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ اُنھوں نے ہنومان جی سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ رام کے نام پر کارسیوکوں میں ہتھیار تقسیم کیا جا رہا ہے تو شری رام چندر جی کہتے ہیں ''لیکن رام کے نام پر یہ

ہتھیار کیوں بانٹے جا رہے ہیں جبکہ میں نے تو ایسے ہتھیار کبھی ہاتھ میں اٹھائے بھی نہیں ہیں۔ اِس پاگل سے کہدو کہ اگر اُسے ہتھیار ہی بانٹنا ہے تو پھر راون کے نام پر بانٹے رام کے نام کو بدنام نہ کرے۔ میں نے تو سنسار کو شانتی اور سدبھاؤنا کا سندیش دیا ہے۔ آتنک اور اشانتی کا نہیں۔''

اِسی طرح ایک جگہ ہنومان جینتی کے دن پوتر ہنومان مندر میں انگلش اسٹائل میں کیک کاٹ کر بجرنگ بلی کا پہلی برتھ ڈے منانے کا مذاق اُڑتے ہوئے دیکھ کر رام جی کہتے ہیں'' جنگی بدھی بھرسٹ ہو چکی ہو اُن کے لئے سدبدھی کی پرارتھنا نرتھک ہے چلو ایودھیا چلو۔ اور بجرنگ بلی نے رتھ ایودھیا کی طرف موڑ دیا۔ شہر میں پہنچے تو ہر طرف سناٹا تھا۔ ہر طرف جیسے ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ زندہ ضرور تھے مگر مردوں کی طرح چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ صدیوں بعد اُنھوں نے ایودھیا کو اِس حال میں دیکھا تو ان کا دل بجھ سا گیا۔ وہ کافی دُکھی ہوئے۔ اچانک اُن کا رتھ وہاں پہنچا جہاں کچھ برس پہلے بابری مسجد تھی اور جسے گرا کر ایک لمبے سنگھرش کے بعد وہاں ایک عالیشان رام مندر بنا دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے اُن کی نظر مندر کی بنیاد پر پڑی۔ اُنھوں نے دیکھا کہ کئی نرکنکال، کھوپڑیاں اور مانس کے لوتھڑے اُس میں دبے پڑے تھے۔ کھمبوں اور دیواروں پر نظر پڑی تو ہر طرف کھوپڑیاں اور اِنسانوں کے جسم چُنے ہوئے تھے۔ اُن کے آس پاس خون کے ریلے اور بڑے بڑے دھبّے تھے اور دردناک چیخیں تھیں جو ماحول میں بار بار گونج اُٹھتی تھیں۔ رام چندر جی نے بجرنگ بلی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور دھیرے سے پوچھا؟ کیا رام مندر ایسا ہی ہوتا ہے؟ جو مانو کھوپڑیوں، نرکنکالوں، خون کے دھبوں اور بے گناہوں کی چیخوں سے بنتا ہے؟ بجرنگ بلی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا نہیں بھگون رام مندر تو مریادا پُرشوتم کے آدرشوں، شردھا، سدبھاؤنا اور بسواس کے پھلوں، مانویہ مُولیوں کی خوشبوؤں سے بنتا ہے۔ جس میں آتما کی سندرتا اور پرماتما کا واس ہوتا ہے۔ رام چندر جی بولے تو پھر ہمیں یہاں سے دور لے چلو دور..... بہت دور۔ اور رتھ ہر تیو لوک سے سورگ لوک کی طرف مُڑ گیا۔ دونوں چُپ اور دُکھی تھے۔ یہ دُکھ ہر پل گہرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔''

تو یہ تھا افسانہ'' رام جی کا دُکھ''۔ عنوان ہی اِتنا دلچسپ اور معنی خیز ہے کہ قاری کا ذہن اپنے آپ پلاٹ پر دوڑ لگانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

بابری مسجد جتنی تاریخی تھی اُس کا انہدام اُس سے بھی بڑی تاریخ بن گیا اور وہ بھی عالمی تاریخ کا ایک سیاہ باب جو قیامت تک غم، غصہ اور مٹھی بھر مذہبی افراد کے ذہنی جنون کی داستان بیان کرتا رہے گا۔ افسانہ 'رام جی کا دکھ' جو سچ اور صرف سچ پر مبنی ہے ابراہیم اشک نے رقم کر کے

اپنی سچائی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے خود ہی لکھا ہے کہ ''سچی کہانیاں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں میں نے تو اُن کو کاغذ پر اُتار دینے کا اپنا فرض بھرادا کیا ہے۔''

کہانی 'رام جی کا دُکھ' کی زبان دراصل ابراہیم اشک کی زبان نہیں ہے۔ یہ پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ جس طرح کہانی کا پلاٹ ہندوستانی ہے اُسی طرح اُس کی زبان بھی ہندوستانی ہے۔ عام بول چال کے ہندی الفاظ سے اُنھوں نے پرہیز نہیں کیا ہے بلکہ کھل کر اُن کی نگینہ کاری کی ہے۔ کہانی کے پلاٹ اور کرداروں کو اگر مدِ نظر رکھیں تو قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِس موضوعاتی اور سچی کہانی کے لئے ایسی ہی ہندی آمیز زبان کی ضرورت تھی۔ اب رام چندر جی اور بجرنگ بلی جی کے مکالمے فارسی یا اُردو میں تو ہوں گے نہیں۔ پھر بھی ابراہیم اشک نے نہ ہی سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا ہے اور نہ ہی فارسی آمیز اُردو کا۔ بس سلیس اُردو اور ہندی لفظوں کو منظر، پلاٹ اور مکالمے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے جہاں جس کی ضرورت تھی وہاں چُن دیا ہے۔ ویسے بھی ابراہیم اشک ہندی بولے جانے والے بیلٹ مالوہ میں پیدا ہوئے۔ ہندی کے ماحول میں ہی پہلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ ہندی زبان میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی اور ہندی ماہنامہ 'سریتا' اور 'دینک اندور سماچار' کی ادارت سے وابستہ رہے تو ظاہر ہی ہے کہ اُنھیں ہندی زبان پر مہارت حاصل ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اُنھیں اُردو نہیں آتی یا اچھی اُردو نہیں لکھتے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر اُن کے بایوڈاٹا سے بڑوانی (اُجین)، اندور یونیورسٹی، ہندی ساہتیہ میں ایم۔اے کی ڈگری یا پھر ماہنامہ سریتا اور دینک اندور سماچار کی ادارت وغیرہ چند جملوں کو ہٹا دیا جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ ابراہیم اشک خالص اُردو والے ہیں اور ہندی سے اُن کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نظم ہو یا نثر، غزل ہو یا تنقیدی مضامین ہر جگہ یکساں عام فہم اُردو الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ وہی روزمرہ کی بول چال والی زبان جو ہمارے گھر آنگن میں بولی جاتی ہے اور یہی عوامی زبان اُن کی پہچان بھی ہے۔ خاص طور پر جب وہ افسانہ لکھتے ہیں تو ہمیں منشی پریم چند کے افسانوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ وہی اُردو لکھتے لکھتے ہندی کے کسی انوٹھے لفظ کا برمحل استعمال کچھ اس طرح جیسے سونے کے زیور میں ہیرے کی نگینہ کاری اور وہ بھی اس چابک دستی کے ساتھ کہ قاری کا دل بے ساختہ تعریف کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ منشی پریم چند اُن کے آدرش ہیں پھر ظاہر ہے کہ فکر اور اندازِ بیاں بھی وہی ہوگا۔

آخر میں میں کہنا چاہوں گا کہ ابراہیم اشک ایک سیدھے سادے سچے افسانہ نگار ہیں۔ جو کچھ بھی اُن کی آنکھیں دیکھتی ہیں جیوں کا تیوں اُسے کاغذ پر اُتار دیتے ہیں۔ اُن کا بے باک قلم

وحویت بھی نہیں ہے۔ یہ اور اسی نوع کے بہت سے لاینحل سوال قاری کے دماغ میں کلبلاتے ہیں، مثلاً یہ کہ مندر کی تعمیر میں جو پتھر اور اینٹیں نصب کئے جاتے ہیں اس میں جے شری رام یا دوسرے دیوتاؤں کے نام وچنھ تو کندہ کئے جاتے ہیں لیکن مسلمان آج بھی رسول کا نام یا اینٹوں پر اللہ لکھوانا یا لگوانا، مسجد کی تعمیر میں بالکل پسند نہیں کرتا، جب کہ ابراہیم اشکؔ نے مسجد کی اینٹوں میں اللہ لکھے ہونے کا ذکر کیا ہے۔

مذکورہ تسامح کے باوصف راقمِ مضمون، ابراہیم اشکؔ کو مبارکباد دیتا ہے کہ انھوں نے فنِ افسانہ نگاری میں اپنی علاحدہ شناخت قائم کرنے کی اچھی کاوش کی ہے۔ ابراہیم اشکؔ کے افسانے کے مطالعے کے بعد ناقدینِ ادب کو ان کی ہمہ جہت ادبی خدمات پر از سرِ نو سوچنے، سمجھنے، پرکھنے اور پھر لکھنے پر مجبور بھی ہونا پڑے گا۔

27/10 Shastri Nagar
Sector 10, Meerut. (U.P.) 250003

☆☆

کبھی بھی حقیقت نگاری اور حق بیانی سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ افسانہ 'رام جی کا دُکھ' ایک ایسی ہی سچّی کہانی ہے اور اُنھوں نے شری رام چندر اور ہنومان جی کو مادھیم بنا کر ساری حقیقت سپردِ قرطاس کرتے ہوئے رام جی کے دکھ کو پوری کائنات کا دُکھ بنا دیا ہے۔ ۲۰ ویں صدی میں منشی پریم چند کا افسانہ ''کفن'' اور سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''کھول دو'' ایسے دو افسانے سماج کی سچّی تصویر پیش کرتے ہوئے بین الاقوامی سطح پر اُردو کی نمائندگی کرتے ہوئے اُبھرے تھے تو ۲۱ ویں صدی میں ابراہیم اشک کا افسانہ ''رام جی کا دُکھ'' مُلک اور سماج کے حالات کی سچّی ترجمانی کرتا ہوا ۲۰ ویں صدی کی افسانوی تاریخ کو دہراتا ہوا نظر آرہا ہے۔

H- 8, Police Radio Colony
Bhadbhad Road, Bhopal (MP)

☆☆☆

IBRAHEEM ASHK: AFSANE AUR TAJZIYE

by

Dr. Manazir Ashiq Harganvi

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی - ابراہیم اشک

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-597-1

جیون دان

باہر دوپہر کی دھوپ کافی تیز تھی اس لیے بچّوں نے گھر ہی کو کھیل کا میدان بنالیا تھا۔ وہ کھیل رہے تھے اور میں ہمیشہ کی طرح کتابوں کے مطالعہ میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا، سامنے ایک خوبصورت سراپا کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے پوچھا ''کس سے ملنا ہے؟''

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''میں آپ ہی سے ملنے آئی ہوں۔''

میں نے اسے اندر آنے کے لیے کہا، وہ اندر آئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خامشی رہی۔ بچّے گھر میں کسی اجنبی کو آیا دیکھ کر دوسرے کمرے میں جا کر کھیلنے لگ گئے تھے۔ بیوی ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی ''پاکیزہ آنچل'' پڑھ رہی تھی۔

میں نے خامشی توڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''آپ نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں، اور..... آپ یہاں کس مقصد سے آئی ہیں؟''

وہ تھوڑی سی مسکرائی اور پھر بولی ''میں کہانی ہوں! میرا مطلب ہے، میرا نام کہانی ہے۔ آپ کے پاس اس مقصد سے آئی ہوں کہ آپ مجھے لکھیں۔ دراصل اس دور میں مجھے صحیح طور پر لکھنے والا کوئی قلم کار نہیں ہے۔ میں نے آپ کی شاعری اور تنقیدی تحریروں کو پڑھا ہے۔ ان میں بڑی سچائی، بیباکی اور فنکارانہ حسن ہے جو تخلیق کو شاہکار بنانے کی قوت رکھتا ہے۔''

میں نے اس کی بات بڑے دھیان سے سنی اور کہا۔ ''لیکن میں تو شاعر اور نقاد ہوں۔ کہانی کار نہیں ہوں۔ پھر میں آپ کو کیسے لکھ سکتا ہوں کہانی تو کوئی کہانی کار ہی لکھ سکتا ہے۔ آپ شاید غلط جگہ پر آ گئی ہیں۔ آپ کو کسی کہانی کار کے پاس جانا چاہئے تھا۔''

''نہیں۔ میں بالکل صحیح جگہ پر آئی ہوں۔'' اُس نے پرزور لہجے میں کہا ''مجھے معلوم ہے

آپ کہانیاں دلچسپی سے پڑھتے رہے ہیں اور کہانی کاروں پر تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ جن میں کہانی کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ بھی بڑی باریکی سے کرتے رہے ہیں۔ انھیں پڑھ کر مجھے اس بات کا احساس ہوا ہے کہ میرے بارے میں جتنا آپ جانتے ہیں موجودہ دور کا کوئی کہانی کار نہیں جانتا۔ اس لیے میری آپ سے گزارش ہے کہ مجھے لکھیں۔'' کہانی نے مجھ سے کہا۔

میں نے اسے سمجھانے اور اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے ایک بہانہ تراشا اور اسے کہا۔

'' دیکھیے۔ میں کہانی اس لیے نہیں لکھتا کہ اس میں حقیقت نہیں ہوتی۔ کہانی محض کہانی ہوتی ہے اس لیے میں آپ کو نہیں لکھ سکتا ہے۔''

وہ کہنے لگی۔'' یہ بات آپ کے منہ سے اچھی نہیں لگتی کیونکہ آپ نے ٹالسٹائے، دوستووسکی، منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، کرشن چندر، انتظار حسین، انور سجاد سب ہی کے یہاں مجھے پڑھا ہے۔ میری حقیقت کو دیکھا ہے۔ اس لیے آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ کہانی محض خیالی ہوتی ہے اس میں حقیقت کے رنگ نہیں ہوتے۔ اب وہ زمانے لد گئے جب بھوت پریت اور پریوں کی کہانیاں گھر کے بوڑھے، بچوں کو سنایا کرتے تھے۔ دیکھیے میں آپ کے پاس بڑی آس لے کر آئی ہوں۔ آپ مجھ سے وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے لکھیں گے۔'' اس کے آخری جملے میں تھوڑی سی لگاوٹ بھی تھی۔

میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔'' ارے بھئی۔ موجودہ دور کے تمام کہانی کاروں نے آپ کو بڑی خوبی کے ساتھ لکھا ہے۔ ان میں محمود ایوبی، شوکت حیات، سلام بن رزاق، انور خان، انور قمر، مشرف عالم ذوقی، رفیق جعفر، جینا بڑے، ایم مبین اور مظہر سلیم سب نے آپ کو لکھنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اور ہاں۔ ایک نام تو میں بھول ہی گیا۔ بڑا ہی اہم نام شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے۔ انھوں نے بھی تو آپ کو بحسن وخوبی لکھا ہے۔''

وہ بڑے نخرے سے بولی'' آپ بھی اچھا مذاق کر لیتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے مجھے کہاں لکھا انھوں نے تو میر تقی میر کو لکھا ہے۔ آپ خواہ مخواہ اُن کے ساتھ میرا نام جوڑ کر مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھیے میں آخری بار آپ کو جتا دیتی ہوں کہ اگر آپ نے مجھے نہیں لکھا تو میں رو دوں گی۔'' وہ واقعی رو آنسی ہونے لگی اور اُدھر'' پاکیزہ آنچل'' پڑھنے والی ہماری بیوی کے کان کھڑے ہونے لگے۔ وہ اُٹھ کر آئی اور ہمارے کمرے میں جھانکنے لگی۔ ہم تھوڑے نروس ہونے لگے۔ بیوی کا جھانکنا بند ہوا تو ہمارے ہوش وحواس بحال ہوئے۔

کہانی نے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔'' آپ بھی اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہیں؟ میں نے

اکثر دیکھا ہے کہ جو کسی سے نہیں ڈرتا وہ اپنی بیوی سے ضرور ڈرتا ہے۔''

''دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ سمجھدار آدمی کو کم عقل سے ڈرنا ہی پڑتا ہے۔'' ہم نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آپ مجھے کب لکھیں گے؟ آپ کا مجھے لکھنا بہت ضروری ہو گیا ہے کیونکہ میری ساری چھٹپٹاہٹ کو آپ ہی کاغذ پر اتار سکتے ہیں۔ اس کے لیے مجھے جو بھی قربانی دینا ہوگی میں تیار ہوں۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے میرے چہرے کو پڑھتے ہوئے کہا۔

''جس دن میرا دل کہے گا، میں تمہیں ضرور لکھوں گا۔ اس دن دنیا کی کوئی طاقت مجھے لکھنے سے نہیں روک پائے گی۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس نے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور میرے ہاتھ میں جو قلم تھا اسے چوم لیا۔ پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگی۔ ''خدا کرے وہ دن جلد آئے جب آپ کا دل مجھے لکھنے کے لیے بیتاب ہو۔'' دعا مانگ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے پھر مجھے ''خدا حافظ'' کہہ کر وہ رخصت ہوگئی۔ میں رات دیر تک جاگتا رہا اور اس کے بارے میں سوچتا رہا، پھر نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

صبح کے آٹھ بجے ہوں گے۔ یہ میرے اٹھنے کا وقت نہیں تھا لیکن بیوی مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا رہی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے کیوں اس قدر پریشان کرنے پر تلی ہوئی ہو؟''

وہ ہڑبڑا کر بولی۔ ''یہ اخبار دیکھو۔ کل جو آپ سے ملنے آئی تھی اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔''

میں نے بیوی سے اخبار لے کر دیکھا پہلے ہی صفحے پر اس کی لاش کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اسے کسی نے اس لیے قتل کر دیا تھا کہ وہ میرے پاس آئی تھی اور اپنے آپ کو لکھوانا چاہتی تھی۔ میرے لیے یہ ایک خبر ہی نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی جو تخلیق کا دھارا بن کر میری رگوں میں دوڑنے لگی تھی۔ اس نے میرے لیے خود کو قربان کر دیا تھا۔

میں نے سوچا۔ میں اس کی اس قربانی کو رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔ میں ایک کہانی لکھوں گا۔ جو وقت کے اوراق پر تاریخ کی طرح روشن ہوگی۔ میں نے قلم اٹھایا اور اسے لکھنا شروع کر دیا۔ اپنی تمام تخلیقی قوت اور جوہر کے ساتھ۔ جیسے جیسے میں لکھتا جا رہا تھا کہانی زندہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مر کر امر ہوگئی تھی۔ اپنی موت کے بعد اسے نیا جیون دان مل گیا تھا۔

☆☆

ابراهیم اشک:

افسانے اور تجزیے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

پروفیسر افتخار اجمل شاہین

تجزیہ — جیون دان

میں ابراہیم اشکؔ کو شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا، شاعر بہت مشہور اور مقبول ہیں اور انھوں نے شاعری کی تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نظم نگار اور گیت نگار کی حیثیت سے تو وہ جانے اور پہچانے جاتے ہی ہیں مگر انھوں نے رباعیات، دوہے اور قطعات لکھ کر بھی اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔ لعلن اور چہارن بھی ان کی ایجادات ہیں، ان اصناف سخن کی تجدید کی ہے۔ مگر اس کے باوجود میں ان کو افسانہ نگار کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا۔ یوں ان کی تنقید کی بھی کوئی کتاب پڑھنے کا مجھے موقع میسّر نہ آسکا۔ میں ان کی رباعی نگاری اور گیت نگاری پر مضامین لکھ چکا ہوں اور یہ دونوں مضامین ان کتابوں میں شامل ہیں جو ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے مرتب کی ہیں۔

بہر حال جب پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے ان کا افسانہ ''جیون دان'' میرے پاس تجزیہ کے لئے بھیجا تو مجھے اسے پڑھ کر ایک خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس خوشگوار حیرت کے کئی اسباب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ یہ ایک عمدہ کہانی ہے، جس نے مجھے متاثر کیا۔ دوسری وجہ حیرت یوں کہ اس دور میں بہت سے کہانی لکھنے والے ایسی کہانیاں لکھتے رہے یا ۲۔ ۳ دہائی پہلے ایسی کہانیاں لکھ رہے تھے جن پر تجریدیت کا غلبہ تھا۔ یا جن پر چیستان یا معمّہ ہونے کا گمان گزرتا تھا، ان میں بقیہ تو بہت کچھ ملتا تھا مگر کہانی کا عنصر غائب ہو چکا تھا، بہت سے لوگوں کو کہانی کی گمشدگی کی بھی شکایت تھی۔ Anti Story کی آواز لگائی جارہی تھی، جدیدیت کے نام پر ایسی کہانیاں بھی لکھی جارہی تھیں جن میں ابلاغ کی کمی تھی، کہانیوں کو مبہم بنایا جارہا تھا اور اسی کو کمال سمجھا جانے لگا تھا۔

ابراہیم اشک نے ان کے اس انداز اور رویّے سے انحراف کیا ہے۔ اور کہانی کے لئے اسطوری، علامتی اور تحریری انداز اختیار کرنے کی بجائے انھوں نے آسان، عام فہم اور بیانیہ انداز اپنایا، اگر چہ اس کہانی میں انھوں نے Myth کا سہارا ضرور لیا ہے مگر کہانی کو استعاروں اور علامتوں

سے گرانبار نہیں کیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ کہانی گم ہوگئی ہے۔ کچھ لوگوں نے کہانی کے اس روش کو دیکھ کر واپسی کے سفر کا نعرہ لگایا یعنی کہانی لکھنے والوں کو پریم چند کے دور میں جانا چاہئے۔ مگر یہاں پر جزوی اختلاف کے ساتھ یہ کہوں گا کہ ان کے کہے کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ ویسی ہی کہانیاں لکھی جائیں جیسی کہ پریم چند یا ان کے دور میں لکھی جاتی تھیں۔ ادب کا سفر رکتا نہیں بلکہ جاری رہتا ہے۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ گزرا ہوا دور واپس نہیں آتا مگر کچھ حقیقتیں ایسی ہیں جن کا ہر دور میں خیال رکھا جاتا ہے یا رکھنا چاہئے۔

یہ بڑا مصروف دور ہے، یہ سائنسی دور ہے، اب لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ کہانیوں کو سمجھنے میں اپنا بہت سا سمئے لگائیں۔ لوگ عام فہم کہانی پڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ کہانی پن یا اس کے اندر دلچسپی تلاش کرتے ہیں۔

ابراہیم اشک کے یہاں کہانی خود ایک کردار کی شکل میں آتی ہے اور ان سے کہانی لکھنے کی فرمائش کرتی ہے۔ کہانی ابراہیم اشک سے اپنا تعارف اس طرح کراتی ہے'' میں کہانی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میرا نام کہانی ہے۔'' اور پھر اپنے آنے کا مقصد بتاتے ہوئے کہتی ہے کہ'' آپ کے پاس اس مقصد سے آئی ہوں کہ آپ مجھے لکھیں، دراصل اس دور میں مجھے صحیح طور پر لکھنے والا کوئی قلم کار نہیں ہے۔'' پھر کہانی یہ کہتی ہے'' میں نے آپ کی شاعری اور تنقیدی تحریروں کو پڑھا ہے ان میں بڑی سچائی، بیباکی اور فن کارانہ حسن ہے۔ جو تخلیق کو شاہکار بنانے کا حسن رکھتا ہے۔'' گویا کہانی کی زبانی ابراہیم اشک یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کہانی لکھنے والوں کے یہاں اب سچائی، بے باکی اور فنکارانہ حسن مفقود ہو چکا ہے۔ یہ تین ایسے عناصر ہیں جو کہانی کو کہانی بناتے ہیں۔ انہیں سے کہانی میں جان اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ پھر جب کہانی کار (ابراہیم اشک) نے یہ بہانہ بنایا کہ'' دیکھئے میں کہانی اس لئے نہیں لکھتا کہ اس میں حقیقت نہیں ہوتی۔ اس لئے میں آپ کو نہیں لکھ سکتا۔'' مگر کہانی اپنے موقف پر ڈٹ جاتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ نے ٹالسٹائی، دوستوسکی، منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر اور انور سجاد وغیرہ کے یہاں مجھے پڑھا ہے اور میری حقیقت کو دیکھا ہے اس لئے آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے۔''

ان حوالوں سے ابراہیم اشک یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اب حقیقت بیانی کا سلسلہ لوگوں نے ترک کر دیا ہے اور ان کے اندر اب مذکورہ بالا انسانوں کی طرح جرأت اور جسارت باقی نہیں رہی اور اسی لئے شاید علامتوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ اسی لئے ان کا انداز بیان بھی مبہم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی اپنا صحیح روپ دیکھنا چاہتی ہے اور اسی بات کا تقاضا وہ ان سے کرتی ہے۔

اس دور کے بھی مختلف افسانہ نگاروں کا ذکر ابراہیم اشک کرتے ہیں جنھوں نے ان کے بقول کہانی کو بڑی خوبی کے ساتھ لکھا ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں وہ شمس الرحمٰن فاروقی کا بھی نام لیتے ہیں۔ اس پر ''کہانی'' ان سے کہتی ہے۔ ''آپ بھی اچھا مذاق کر لیتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے مجھے کہاں لکھا۔ انھوں نے تو میر تقی میر کو لکھا ہے۔ آپ خواہ مخواہ ان کے ساتھ میرا نام جوڑ کر مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔''

اس طرح ''کہانی'' نے کہانی کار کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ اس نے کہانی لکھنے کا وعدہ نہیں کر لیا اس کے بعد:

''کہانی نے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور میرے ہاتھ میں جو قلم تھا اسے چوم لیا۔'' صبح کے وقت جب کہانی کار کی بیوی نے ان کو جگایا تو انھوں نے اس سے پوچھا کہ ''کیا بات ہے کیوں اس قدر پریشان کرنے پر تلی ہو۔'' وہ ہڑبڑا کر بولی ''یہ اخبار دیکھو کل جو آپ سے ملنے آئی تھی اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔'' پھر کہانی کار کہتا ہے کہ وہ اس کی (یعنی کہانی کی) قربانی کو رائیگاں جانے نہیں دے گا ''میں ایک کہانی لکھوں گا جو وقت کے اوراق پر تاریخ کی طرح روشن ہوگی۔''

اس کہانی کو پڑھ کر اور اس کے عنوان کو دیکھ کر مجھے معاً یہ خیال آیا کہ اس سلسلے میں کہانی کار نے فینکس (Phoenix) کا سہارا لیا ہے۔ جو اسطوری یا داستانی پرندہ ہے۔ وہ کئی سو سال تک زندہ رہتا ہے مگر جب اس کی موت قریب آتی ہے تو وہ خود کو جلا دیتا ہے۔ پھر اسی کی راکھ سے وہ پرندہ ایک نئی توانائی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں آکسفورڈ ڈکشنری کا سہارا لیا تو اس میں اس پرندے سے متعلق یہ لکھا ہوا ملا:

> Phoenix— mythical bird of the Arabian desert said to live for several hundred years, before burning itself and then rising born again from its ashes.

اس طرح ''کہانی'' اپنا جیون دان دے کر یعنی جان کی قربانی دے کر کہانی کو نئی زندگی کی نئی نوید دیتی ہے اور کہانی کار کہانی کو ایک نئی زندگی دینے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

G-09, Saima classic, Gulshan-e-Iqbal,
Block- 10-A, Rashid Minhas Road,
Karachi- 75300 (Pakistan)

☆☆

زندہ تصویر

اشوک ابھی پانچ سال ہی کا تھا کہ اس کی ماں مرگئی تھی۔ باپ نے جلد ہی دوسری شادی کرلی تھی۔ سوتیلی ماں کی شکایتیں اور باپ کی مار پیٹ سے اشوک تنگ آچکا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب اس کا باپ اسے لاتوں اور تھپڑوں سے نہیں مارتا تھا۔ تین سال اور اسی ظلم وستم کے سائے میں گزر گئے تھے۔ اشوک کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ اس کا باپ کمہار تھا اور مٹی کے برتن بنا کر گاؤں میں اناج کے بدلے میں بیچا کرتا تھا۔ اس کام میں وہ دن بھر اشوک کو اپنے ساتھ لگائے رکھتا تھا۔ اشوک کا بہت دل چاہتا کہ وہ اپنے ہم عصر بچّوں کے ساتھ کھیلے کودے لیکن اس کی یہ خواہش دل ہی دل میں دب کر رہ جاتی تھی۔

آج اشوک کے باپ نے اسے ٹھاکر صاحب کے یہاں کچھ برتن دینے بھیجا تھا۔ وہ جب ٹھاکر صاحب کے یہاں پہنچا تو اس نے دیکھا ٹھاکر صاحب اپنے پوتے کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہیں۔ ان کا پوتا ہوائی جہاز کے کھلونے میں چابی بھرتا اور پھر اسے اڑا دیتا۔ اشوک نے ہوائی جہاز کے کھلونے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے وہ اڑتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب کا پوتا بھی اشوک کے برابر ہی تھا۔ اشوک کے ساتھ جلد ہی وہ گھل مل گیا اور اس کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اس نے ہوائی جہاز اشوک کو بھی اڑانے کے لیے دیا۔ اشوک نے اس میں چابی بھر جب اڑایا تو اسے بہت اچھا لگا۔ ٹھاکر صاحب کے پوتے نے اشوک سے پوچھا ''تم ہمارے ساتھ ممبئی چلوگے۔ میں تمہیں بہت سارے کھلونے دوں گا۔ ہم دونوں وہاں ساتھ مل کر خوب کھیلیں گے۔''

کھیل کھیل میں اشوک گھر جانا بھول ہی گیا تھا۔ وہ ٹھاکر صاحب کے پوتے کے ساتھ کھیلتا رہا۔ اُدھر اشوک کا باپ اسے ڈھونڈتا ہوا ٹھاکر صاحب کے گھر پر آ گیا۔ اور اشوک کو اپنے ساتھ لے کر جب اپنے گھر پہنچا تو دیر ہو جانے کی وجہ سے اشوک کو بری طرح مارنے پیٹنے لگا۔ مارتے مارتے جب اس کا باپ تھک گیا تو اشوک کو اس نے ایک کونے میں ڈھکیل دیا۔ وہیں

روتے روتے اسے نیند آ گئی اور وہ بھوکا پیاسا نہ جانے کب تک سوتا رہا۔ دیر رات جب اسے بھوک لگی تو وہ اٹھا اور گھر سے بھاگ نکلا۔ اس کے کانوں میں ٹھاکر صاحب کے پوتے کے لفظ گونج رہے تھے۔ ''تم ہمارے ساتھ بمبئی چلو گے۔ میں تمہیں بہت سارے کھلونے دوں گا۔''

گاؤں کے اسٹیشن پر جب وہ پہنچا تو بمبئی کی طرف جانے والی ریل گاڑی کھڑی تھی اشوک اس میں بیٹھ گیا اور بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی میں اس نے ٹھاکر صاحب کے پوتے کا گھر بہت ڈھونڈا لیکن اسے نہیں ملا۔ کئی دن اسے ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے ہو گئے تھے۔ ایک دن وہ باندرا کے فٹ پاتھ پر بھٹک رہا تھا کہ فریم میں جڑی ہوئی کچھ تصویریں دیکھ کر رک گیا۔ اشوک کو یہ تصویریں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ بڑے غور سے اُن تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ مصوّر علی نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو اپنی تصویریں اس قدر دلچسپی سے دیکھتے ہوئے دیکھا تو اس پر پیار آنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ لیکن اشوک تو تصویریں دیکھنے میں کھویا ہوا تھا۔

مصور علی نے اشوک سے پوچھا'' کیا ارادہ ہے۔ خریدو گے؟''

اشوک نے بھولے پن سے کہا'' کتنے کی ہے؟''

علی نے مسکرا کر کہا۔'' دس ہزار روپے کی۔''

اشوک بولا۔'' یہ تو بہت زیادہ ہے۔''

علی نے بچّے کی معصومیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوال کیا۔'' زیادہ ہے تو تم کتنے روپے میں لو گے؟''

'' ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' اشوک نے اداس من سے کہا۔

اس کے چہرے کی اداسی مصور علی کے دل میں گہرائی تک اترتی چلی گئی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر اشوک کو پیار سے اپنے پاس بیٹھالیا اور سب کچھ اُس سے پوچھ لیا۔ اس لاوارث اور دکھی بچّے میں علی کو اپنی زندگی کا مقصد نظر آنے لگا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اشوک کو پڑھا لکھا کر ہوائی جہاز اڑانے کے قابل بنائے گا اور اسے آسمان کی بلندیوں تک پہنچائے گا۔ علی نے اشوک کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ وہ اسے اپنے بیٹے سے بھی زیادہ چاہتا اور پیار کرتا تھا۔ اشوک بھی علی کی باپ کی طرح خدمت کرتا تھا۔ دونوں بڑے پیار سے رہتے تھے۔

علی تصویریں بناتا اور فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر انہیں بیچتا تھا۔ اس کی تصویروں میں سچائی اور بیباکی نظر آتی تھی وہ اپنے قلم سے وقت کی تاریخ لکھتا تھا اس لیے عام روایتی تصویروں سے وہ مختلف اور منفرد ہوتی تھیں۔ لوگ ان تصویروں کی طرف مائل ہوتے اور ان کی معنویت سے متاثر

ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔علی کو ان تصویروں کے اچھے دام ملتے تھے۔یہ روپئے وہ اشوک کی زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں خرچ کرتا تھا۔ایسا کر کے علی کو بڑا سکون ملتا تھا۔اشوک بھی پڑھنے لکھنے میں ہوشیار تھا۔جلد ہی وہ کامیابی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتا علی اس کے پاس ہونے پر مٹھائیاں بانٹتا اور خوشیاں مناتا تھا۔

علی کی زندگی کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی۔باپ پروفیسر تھا اور ماں اسکول ٹیچر۔علی ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔تصویریں بنانے کا علی کو بچپن سے شوق تھا۔ماں باپ علی کی تصویریں دیکھ کر بڑے خوش ہوتے۔باندرہ کارٹر روڈ پر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں وہ خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ اس روز علی کی ماں اور والد اپنے اسکول اور کالج گئے ہوئے تھے۔شہر میں فساد ہو گیا تھا۔علی کے والد کالج سے آتے وقت اپنی بیوی کو اسکول سے اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھا کر واپس گھر آتے تھے۔اس دن بھی وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھے کہ راستے میں انھیں فسادیوں نے گھیر لیا اور قتل کر دیا۔تب سے علی اکیلا باندرہ کارٹر روڈ پر رہ رہا تھا۔

اس درمیان علی کی زندگی میں ایک خوبصورت لڑکی بھی آئی جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔لیکن عام طور پر ممبئی شہر کی لڑکیاں دولت مند لوگوں کے چکر میں اپنے سچے عاشق کا دل توڑنے میں بڑی مہارت رکھتی ہیں۔علی کی محبوبہ بھی ایسی ہی ایک بیوفا لڑکی تھی جس نے علی کے دل سے کھلونے کی طرح کھیلا اور پھر توڑ کر ایک دولت مند باپ کے اکلوتے بیٹے سے شادی رچالی تھی۔ علی نے اس کے بعد کسی لڑکی کو چاہا نہیں کیونکہ اسے عورت نام ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔علی نے اپنی محبوبہ کی یاد میں ایک بہت ہی خوبصورت تصویر بنا رکھی تھی جس میں وہ کسی شاعر کی غزل سے کسی طرح کم دلکش نہیں دکھائی دیتی تھی۔علی جو بھی تصویر بناتا اسے بیچ دیتا تھا لیکن اس تصویر کو بیچنے کے خیال ہی سے وہ پریشان ہو جاتا تھا۔کئی لوگ یہ تصویر خریدنے کی خواہش ظاہر کر چکے تھے۔اسے منہ مانگی رقم دینے کے لیے بھی تیار تھے لیکن علی نے یہ تصویر بیچنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔اشوک جانتا تھا کہ علی اس تصویر کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اس لیے وہ اسے بڑے جتن سے سنبھال کر رکھتا۔اُس پر ذرا بھی گرد نہیں جمنے دیتا۔

اب اشوک نے بی اے کر لیا تھا اور وہ رزلٹ لے کر گھر آیا تو پتا چلا کہ علی ایک زبردست حادثے کا شکار ہو گئے ہیں اور انہیں اسپتال میں داخل کیا گیا ہے۔اشوک اسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ علی ابھی بے ہوش ہیں۔اشوک کا رو رو کر بُرا حال تھا ایسے میں کوئی اسے تسلی دینے والا بھی نہیں تھا۔علی کی زندگی کے لیے اشوک کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا۔علی کو جب ہوش آیا تو ڈاکٹروں

نے اشوک کو بتایا کہ حادثے کا ان کی آنکھوں کی روشنی پر بھی اثر پڑا ہے۔ اور اب وہ شاید دیکھ نہیں سکتے ہیں۔ کئی دن اسپتال میں رہنے کے بعد آخر علی کو ڈاکٹروں نے چھٹی دے دی۔ اس دوران صحتیاب ہونے میں ہزاروں روپئے خرچ ہو گئے تھے یہ روپئے علی نے اشوک کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بچا بچا کر رکھے تھے۔ اب گھر میں کچھ نہیں بچا تھا۔

اشوک نوکری کی تلاش میں در در بھٹکنے لگا لیکن اسے کہیں نوکری نہیں ملی۔ ایک دن اشوک نے عجیب منظر دیکھا۔ علی برش اور رنگ سے تصویر بنانے کی کوشش میں مصروف ہے جب کہ اس کی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اشوک نے پاس جا کر پوچھا۔

''کیا کر رہے ہیں بابا؟''

''تصویر بنا رہا ہوں بیٹا۔ لیکن میری آنکھیں ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔ تمہارے پاس تو آنکھیں ہیں کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟''

اشوک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ علی نے اشوک کے چہرے پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ علی کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ علی نے بڑی ہی درد بھری آواز میں کہا۔ ''بیٹا اشوک۔ کیسے بُرے دن آ گئے ہیں ہمارے۔ ہم دونوں مل کر بھی اپنے آنسوؤں سے زندگی کی ایک تصویر نہیں بنا سکتے۔''

اشوک پھٹ پڑا۔ اس کے ہونٹوں سے صرف اتنا ہی نکلا ''بابا۔'' اور وہ اپنے علی بابا سے لپٹ کر بے تحاشا رونے لگا۔ علی کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ نہ جانے کب اس کی ہچکیاں تھمیں اور دونوں چپ ہو کر ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔

علی کا علاج ابھی جاری تھا۔ آنکھوں کے ماہر ایک ڈاکٹر نے اشوک کو بتایا تھا کہ آنکھوں کے ایک خاص آپریشن کے بعد ہو سکتا ہے علی کی آنکھیں پھر دیکھنے لگیں۔ لیکن اس کے لیے دو لاکھ روپئے کہاں سے لائے تا کہ علی بابا کو ان کی آنکھوں کی روشنی واپس مل سکے۔

گھر میں کچھ تصویریں تھیں علی بابا نے اشوک سے کہا۔ ''اب ان تصویروں کو بیچ دو۔ بس ایک تصویر رہنے دینا۔ جو انمول ہے۔ جس کا کوئی مول اس دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ جسے اب بھلے ہی میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ پاؤں لیکن میرے دل کی آنکھوں میں وہ ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ میں اسے چھو کر بھی محسوس کر سکتا ہوں کیونکہ وہ میری محبت کا سچا احساس ہے۔ میری دھڑکن ہے۔ میری جان ہے۔ بس اس ایک تصویر کے علاوہ دوسری سب تصویریں بیچ دو۔ تا کہ گھر کا خرچ چل سکے۔''

اشوک نے سب تصویریں بیچ دیں اور علی بابا کا علاج کراتا رہا۔ اب گھر میں بس وہ ایک

ہی تصویر رہ گئی تھی جسے بیچنے کے لیے علی بابا نے منع کیا تھا۔ ایک دن ایسا گاہک آیا جو اس تصویر کے منہ مانگے دام دینا چاہتا تھا۔ یہ وہی دولت مند شخص تھا جس نے علی بابا کی محبوبہ سے شادی کی تھی۔ اپنی بیوی کی پچیسویں سالگرہ پر وہ یہ نایاب تحفہ اسے دینا چاہتا تھا۔ اشوک نے سوچا اگر یہ تصویر بیچنے سے بابا کی آنکھوں کی روشنی واپس آجائے تو سودا برا نہیں ہوگا۔ اشوک نے تصویر کے پانچ لاکھ روپے مانگے لیکن گاہک کے سامنے ایک شرط یہ رکھ دی کہ وہ تصویر کی فریم نہیں دے گا۔ گاہک نے کہا'' کوئی بات نہیں۔ ہم فریم دوسری بنوالیں گے بلکہ یہ فریم پرانی بھی ہو چلی ہے اس تصویر کے لیے تو نئی فریم ہی ہونی چاہئے۔''

اشوک نے فریم سے تصویر نکال کر بیچ دی اور پانچ لاکھ روپے لے لیے۔ وہ خوش تھا کہ اب علی بابا کی آنکھوں کا آپریشن آسانی سے ہو جائے گا اور گھر کا خرچ بھی چلتا رہے گا۔ علی بابا جب بھی خالی فریم کو چھو کر دیکھیں گے انہیں یہی احساس ہوگا کہ ان کی محبوبہ کی تصویر وہاں موجود ہے۔

اس درمیان ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ علی بابا کے فن کا ایک چاہنے والا امریکہ سے ہندوستان ان کی تصویر خریدنے آیا۔ علی بابا کو اس حالت میں دیکھ کر اسے بہت افسوس ہوا۔ علی بابا کہنے لگے۔'' آپ نے بہت دیر کر دی میری ساری تصویریں بک چکی ہیں۔ بس ایک تصویر اور بچی ہے۔ یہ جو سامنے دیوار پر ٹنگی ہے۔ یہ میری محبت کی یادگار ہے اور یہ میں کسی کو بھی نہیں بیچ سکتا۔''

گاہک نے خالی فریم دیکھ کر کچھ کہنا چاہا لیکن اشوک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ ایسا کرتے وقت اشوک کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ علی بابا اس درمیان اپنی جگہ سے اٹھے اور انھوں نے فریم کو ہاتھوں سے چھوا اور پھر بڑے پیار سے اسے بوسہ دیا۔ ان کی آنکھیں ایسا کرتے ہوئے نم ہو چلی تھیں اور اشوک کی آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

وہ آدمی جب واپس جانے لگا تو اشوک نے اسے ساری حقیقت بتادی کہ کس لیے اس نے تصویر بیچ کر خالی فریم علی بابا کی تسلی کے لیے رکھی ہوئی ہے۔

اشوک نے علی بابا کی آنکھوں کے آپریشن کا پورا انتظام کیا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہہ دیا تھا کہ دو لاکھ سے زیادہ بھی اگر خرچ آئے گا تو وہ پروانہ کرے لیکن علی بابا کی روشنی واپس آنا چاہئے۔ اس کے لیے اگر اس کی آنکھوں کی ضرورت بھی پڑ جائے تو وہ دینے کے لیے تیار ہے۔ ڈاکٹر نے اشوک کو تسلی دیتے ہوئے کہا'' ایشور نے چاہا تو آپریشن کے بعد ان کی روشنی واپس آجائے گی ابھی وہ نوبت نہیں آئی ہے کہ آپ کو اپنی آنکھیں علی بابا کے لیے دینا پڑے۔''

ڈاکٹر بڑا ماہر تھا۔ اب تک کئی آپریشن وہ آنکھوں کے کر چکا تھا اور سب ہی کامیاب ہوئے تھے۔ علی بابا کی آنکھوں کا آپریشن بھی کامیاب رہا۔ پٹیاں کھلیں تو انھوں نے سب سے پہلے اپنے سامنے اشوک کو کھڑا پایا ایک بیٹے کی طرح ایک وفادار خادم کی طرح۔ انھوں نے اسے اپنے پاس بلایا اس کی پیشانی کو چوما اور سینے سے لگالیا۔ اشوک بہت خوش تھا کہ علی بابا دوبارہ دیکھنے لگے تھے۔

دونوں خوشی خوشی گھر پہنچے۔ جو گھر کبھی تصویروں سے سجا رہتا تھا اب وہاں ایک تصویر بھی نہیں تھی۔ علی کو اپنا گھر دشت کا منظر نظر آنے لگا۔ ایک عجیب سی ویرانی اسے ہر طرف نظر آنے لگی۔ اچانک علی کی نظر اُس خالی فریم پر پڑی جس میں کبھی اس کی خاص تصویر جڑی رہتی تھی۔ اب اس فریم میں تصویر نہیں تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے جسم سے روح نکل گئی ہے اور اس کی جگہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ وہ فریم اسے ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آنے لگا۔ علی بابا نے اشوک سے پوچھا ''اس فریم میں جو تصویر تھی وہ کہاں گئی؟''

اشوک لاجواب ہو کر ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔

علی بابا بھڑک اٹھے۔ مارے غصّے کے ان کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ وہ اشوک سے بار بار پوچھے جا رہے تھے کہ وہ تصویر کہاں گئی؟ آخر کار اشوک نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ اشوک نے روتے روتے کہا۔ ''بابا۔ کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا۔ کاش میں اپنے آپ کو بیچ کر آپ کے لیے کچھ کر سکتا لیکن مجھے خریدنے والا کوئی نہیں تھا۔''

اشوک کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر علی بابا پگھل گئے۔ ان کا سارا غصّہ کافور ہو گیا۔ وہ سنجیدہ ہو گئے۔ اور اشوک سے کہنے لگے۔ ''میں تو بھول ہی گیا تھا۔ میری اصل جیتی جاگتی تصویر تو تم ہو۔ تم سے بہتر کوئی دوسری تصویر میں نے آج تک نہیں بنائی ہے۔ ایسی تصویر جو بولتی ہے، دیکھتی ہے، ہنستی ہے، روتی ہے، چلتی پھرتی ہے۔ میرے دکھ درد کو سمجھتی ہے۔ جب ایسی نایاب تصویر میرے پاس ہے تو مجھے اُس بے جان تصویر کی اب کیا ضرورت ہے۔''

☆☆

ڈاکٹر رضوان احمد

تجزیہ — زندہ تصویر

افسانہ ''زندہ تصویر'' ایک متحرک تصویر بن کر ابھرتا ہے۔ اپنی فنکاری اور چابکدستی سے ابراہیم اشک نے اس میں جان ڈال دی ہے۔ دراصل یہ ایک افسانہ نہیں کئی افسانے ہیں جو زندگی کی تلخ حقیقتیں پیش کرتے ہیں۔ ایک تصویر اشوک کی ہے جس کی ماں بچپن میں ہی مرجاتی ہے جب اس کی عمر محض ۵ سال تھی اس کی سوتیلی ماں اس پر ظلم ڈھاتی ہے اور دوسری بیوی کی خوشنودی کے لئے باپ بھی اس پر مظالم ڈھاتا رہتا ہے اور ان مظالم سے تنگ آ کر اشوک بھاگ کر بمبئی چلا جاتا ہے۔ جہاں اس کی ملاقات بھوک، پیاس اور بیکاری سے ہوتے ہوئے علی سے ہوتی ہے۔ جو ایک مصور ہے۔ ایک باکمال مصور، لیکن اس باکمال مصور کو اشوک کے اندر لافانی تصویر نظر آتی ہے اور وہ اس تصویر کو سنوارنے میں لگ جاتا ہے۔ اشوک پڑھ لکھ کر فضا میں پرواز کرنے کا تصور کرتا ہے، لیکن اسے اپنے پروں کی شکستگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ بقول شاعر ؎

مجھے بھی پرواز کی تمنا
مگر میری ذات پر شکستہ

اس کے باوجود علی اسے دن رات سجانے اور سنوارنے میں لگا ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی زندگی کے عجیب نشیب و فراز سے گزرا تھا۔ اس کے والد پروفیسر تھے اور ماں اسکول ٹیچر۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اسے بچپن سے ہی تصویریں بنانے کا شوق تھا اور ماں باپ بیٹے کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ان کی زندگی بہت خوش و خرم گزر رہی تھی کسی قسم کی ہلچل نہیں تھی لیکن اچانک ہی شہر میں فساد ہوتا ہے اور علی کے ماں باپ دونوں فسادیوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ اس طرح علی دنیا میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ ایک لڑکی اس کی زندگی میں آتی ہے۔ لیکن وہ صرف دولت کی پجاری ہے۔ اس لئے وہ اس کے ساتھ بے وفائی کرتی ہے۔ اس بے وفائی کے سبب اسے عورت کے نام سے ہی نفرت ہوجاتی ہے۔ تنہائی سے تنگ آ کر علی اپنے آپ کو رنگ و روغن

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ!

IBRAHEEM ASHK:
AFSANE AUR TAJZIYE

by

Dr. Manazir Ashiq Harganvi

Year of Ist Edition 2009
ISBN 978-81-8223-597-7
Price Rs. 130/-

نام کتاب : ابراہیم اشک: افسانے اور تجزیے
مصنف : ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
سن اشاعت اوّل : ۲۰۰۹ء
قیمت : ۱۳۰ روپے
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

اور برش میں غرق کر دیتا ہے۔ شب و روز اس کی یہی مصروفیت ہے اور وہ ڈوب کر ایک تصویر بناتا ہے۔ جسے دیکھنے والے اس کی منہ مانگی قیمت دے کر اسے خریدنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن علی اسے کسی قیمت پر فروخت نہیں کرتا بلکہ ایک فریم میں سجا کر اس کو اپنے پاس رکھتا ہے۔

اس میں ایک مرحلہ پھر اور آتا ہے۔ جب اشوک گریجویشن کرنے کے بعد اپنا ریزلٹ لے کر گھر آتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ علی ایک حادثہ کا شکار ہو گیا ہے اور اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اس حادثہ میں علی اپنی آنکھوں کی روشنی کھو دیتا ہے۔ اشوک اس کے علاج پر سارے پیسے خرچ کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی رقم باقی نہیں بچتی اور علی زندگی کی جنگ جاری رکھنے کے لئے اپنی بے نور آنکھوں سے بھی تصویریں بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اشوک کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور علی جو درد بھرا جملہ کہتا ہے وہ قاری کے دل میں ٹیس بن کر اتر جاتا ہے:

''بیٹا اشوک کیسے بُرے دن آگئے ہیں ہمارے، ہم دونوں مل کر بھی اپنے آنسوؤں سے زندگی کی ایک تصویر نہیں بنا سکتے۔''

اپنی بے نور آنکھوں سے ہر طرف سے مایوس ہو کر علی اشوک سے کہتا ہے کہ تم ساری تصویروں کو بیچ دو صرف ایک تصویر رہنے دینا جو انمول ہے جس کی کوئی قیمت اس دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ علی کی آنکھیں بے نور ہو چکی ہیں۔ وہ ان تصویروں کو دیکھ نہیں سکتا لیکن ایک تصویر تو اس کے ذہن و دل میں بستی ہے۔ اس لئے وہ اس تصویر کو کسی قیمت پر بیچ نہیں سکتا، کسی حالت میں بیچنا نہیں چاہتا۔ ان حالات میں اشوک نے تمام تصویریں بیچ دیں اور علی کا علاج کراتا رہا۔ گھر میں صرف وہی تصویر باقی رہ گئی جسے علی نے بیچنے سے منع کیا تھا۔ ان حالات میں اشوک بالکل بے بس ہو کر رہ گیا۔ مگر اسی درمیان ایک واقعہ ایسا ہوتا ہے جو اشوک کو وہ تصویر بیچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایک شخص آتا ہے اور وہ اکلوتی بچی ہوئی تصویر کو ۵ لاکھ روپے میں خریدنا چاہتا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس نے علی کی محبوبہ سے شادی کی تھی اور وہ اس تصویر کو اپنی بیوی کو تحفہ میں دینا چاہتا ہے۔ ان حالات میں اشوک تصویر کو بیچ دیتا ہے اور پھر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کے لئے اسے اپنے دل پر بے حد جبر کرنا پڑتا ہے۔ یعنی وہ اپنے علی بابا کو دھوکہ دے دیتا ہے۔ وہ تصویر کو فریم سے نکال کر گاہک کے حوالے کر دیتا ہے اور خالی فریم گھر میں رہنے دیتا ہے۔ جسے چھو کر علی دیکھتا رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے اس کی من چاہی تصویر اب بھی فریم کے اندر موجود ہے۔ ملے ہوئے روپیوں سے اشوک علی کا علاج کرواتا ہے۔ علی کی آنکھوں کا آپریشن ہوتا ہے، اس کی آنکھوں کی روشنی واپس آجاتی ہے۔ وہ جب اپنے گھر پہنچتا ہے تو اسے اپنی پسندیدہ تصویر نظر نہیں آتی۔ اس کی آنکھوں کے

سامنے ویرانی چھا جاتی ہے۔ وہ اشوک پر برافروختہ ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ وہ تصویر کہاں چلی گئی۔ ایسے میں اشوک اسے روتے ہوئے سب کچھ سچ سچ بتا دیتا ہے۔ ''بابا کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا، کاش میں اپنے آپ کو بیچ کر آپ کے لئے کچھ کر سکتا لیکن مجھے خریدنے والا کوئی نہیں تھا۔''

اس کے بعد کہانی کا کلائمیکس آتا ہے۔ اشوک کی بات سن کر علی کا غصہ کافور ہو جاتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس سے کہانی میں نئی جان پڑ جاتی ہے۔ ''میں تو بھول ہی گیا تھا میری اصل جیتی جاگتی تصویر تو تم ہو، تم سے بہتر کوئی دوسری تصویر میں نے آج تک نہیں بنائی، ایسی تصویر جو بولتی ہے، دیکھتی ہے، ہنستی، روتی ہے، چلتی پھرتی ہے، میرے دکھ درد کو سمجھتی ہے، جب ایسی نایاب تصویر میرے پاس ہے تو مجھے اس بے جان تصویر کی اب کیا ضرورت ہے۔''

ابراہیم اشک نے بڑی چابکدستی سے ایک کہانی میں کئی کہانیاں لکھ دی ہیں۔ ایک طرف اشوک کی غربت ہے، اس کا باپ کمہار ہے جو کچے برتن بنا کر گاؤں میں بیچتا ہے۔ یہ کچا برتن دراصل دنیا کی ناپائیداری کی علامت ہے۔ کچے برتن ٹوٹ جاتے ہیں، جس طرح سے دنیاوی رشتہ ٹوٹتے اور بکھرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے اشوک بھی ماں باپ کے ساتھ اپنے رشتوں کو توڑ کر ممبئی چلا جاتا ہے۔ ممبئی جو دراصل ایک انسانوں کا سمندر ہے، جہاں آدمی ایک تنکے کی طرح بہتا رہتا ہے اور کوئی اس کو پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ اشوک بھی انہیں لہروں میں گم ہو جاتا اگر اسے مصور علی کی سرپرستی حاصل نہ ہو جاتی۔ علی نے معصوم اشوک کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ اسے پڑھایا لکھایا اور اس کی زندگی کو ایک نئی شکل وصورت دینے کی کوشش کی۔ یہاں پر علی اور اشوک کے تعلقات کو قومی یکجہتی کی علامت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ حالانکہ علی کی زندگی کا یہ عجیب وغریب واقعہ تھا کہ اس کے ماں باپ شہر کے فرقہ وارانہ فساد میں مارے جاتے ہیں اس کے باوجود علی کے ذہن میں فرقہ واریت کا شائبہ تک نہیں۔

اس کہانی میں اک خوبصورت موڑ اس وقت آتا ہے جب ایک حسین لڑکی علی کی زندگی میں آتی ہے لیکن یہ لڑکی بھی بڑے شہروں کی ان لڑکیوں کی طرح سے ہی ہے جو معصوم افراد کے دل سے کھلونے کی طرح کھیلتی ہیں اور پھر اسے توڑ دیتی ہیں۔ لیکن علی کے دل کی یہ شکستگی اس کی مصوری میں ایک نیا رنگ بھر دیتی ہے۔ اس کی فنکاری کو نئی علامتیں مل جاتی ہیں اور پھر علی ایک ایسی تصویر کی تشکیل کرتا ہے جو اس کی زندگی کا محاصل ہے۔ وہ بے وفا لڑکی تو اس کی زندگی سے چلی جاتی ہے مگر وہ تصویر نہ صرف دیوار پر بلکہ اس کے نہاں خانے میں بھی زندہ رہتی ہے یہاں تک کہ ایک حادثہ میں اس کی آنکھوں کی روشنی چلی جاتی ہے مگر اس کی بے نور آنکھیں اس تصویر کو اپنے دل میں سجائے

رکھتی ہیں۔لیکن تصویریں تو تصویریں ہوتی ہیں،ان میں بہرحال جان نہیں آسکتی۔وہی اس تصویر کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔اشوک اسے بیچ کر علی کی آنکھوں کا علاج کرواتا ہے اور آپریشن کے بعد جب علی کی آنکھوں میں روشنی آجاتی ہے تو وہ اسی تصویر کو بیچنے کی خواہش کرتا ہے اور جب اس کو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ تصویر تو اب ہے ہی نہیں،اسے بیچ کر ہی اس کی آنکھوں کا اشوک نے علاج کروایا ہے تو اسے بے حد صدمہ ہوتا ہے،مگر پھر اس کو احساس ہوجاتا ہے کہ زندگی کی حقیقت تو کچھ اور ہے، زندگی کے رشتے کچھ اور ہیں،کاغذ پر بنی ہوئی روغنی تصویر تو بے معنی ہے،اصل تصویر تو وہ ہے جسے خالق کل بناتا ہے اور جس کی تربیت انسان کرتا ہے۔یہ ابراہیم اشکؔ کی بہت ہی کامیاب کہانی ہے جو قاری کے ذہن میں بہت گہرا تاثر چھوڑ جاتی ہے اور بے جان تصویر اچانک ہی زندہ ہو کر کسمسانے لگتی ہے۔

202, Hytec Regency, K.M. Singh Lane,
Rai Saheb ki Gali,Boring Canal Road (East)
Patna-800001

☆☆

بیکری

سمیع اللہ بیکری کا بہترین کاریگر تھا۔اس کی بیکری میں جو چیزیں بنتی تھیں ان کا ذائقہ نرالا ہوتا تھا۔شہر کے تمام لوگ اس کی بیکری میں بننے والی ڈبل روٹی اور ٹوس کے ناشتے سے اپنے دن کا آغاز کرتے تھے۔بچّے چائے اور دودھ میں بھگو کر اُنہیں بڑے مزے سے کھاتے۔اگر کبھی ناشتے میں یہ چیزیں نہیں ملتیں تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا۔بچّے تو رو رو کر ماں باپ کی ناک میں دم کر دیتے۔جب تک انھیں ڈبل روٹی اور ٹوس نہیں ملتے وہ چپ نہیں ہوتے۔

ڈبل روٹی اور ٹوس کے علاوہ سمیع اللہ طرح طرح کے بسکٹ بھی بناتا تھا۔ان میں نمکین بھی ہوتے تھے اور میٹھے بھی۔کچھ کا جَو والے ہوتے تو کچھ بادام والے۔یہ بسکٹ عام گھروں میں ڈبوں میں بھرے ہوتے یا پھر شیشے کی برنیوں میں سجے ہوتے تھے۔جب بھی گھر میں کوئی مہمان آتا چائے کے ساتھ بھلے گھر کی عورتیں یہ بسکٹ بڑے جتن سے پلیٹوں میں سجا کر رکھتیں اور اپنے سگھڑ ہونے کا ثبوت دیتیں۔سمیع اللہ کھاری اور نان بھی بہت اچھے بناتا تھا۔اس کے بنائے ہوئے نان شادی، بیاہ، جنم دن یا ایسے ہی خوشی کے موقع پر دی جانے والی پارٹیوں کی زینت بنتے تھے۔سمیع اللہ کی بیکری سارے شہر میں مشہور تھی، ہر ایک کی زبان پر اس کا چرچا تھا۔

شہر کی دکانوں پر سمیع اللہ کی بیکری کی چیزیں خوب بکتی تھیں۔وہ دام واجبی رکھتا تھا۔اس نے کبھی نہیں سوچا کہ وہ ان چیزوں کی مقبولیت سے بیجا فائدہ اٹھا کر قیمتیں بڑھا دے اور ناجائز طور پر عوام سے روپے اینٹھے۔سمیع اللہ سچا مسلمان تھا اور اپنے دھندے میں وہ مناسب روپیہ کمانے ہی میں یقین رکھتا تھا۔اس لیے خدا نے اس کے دھندے میں برکت دے رکھی تھی۔وہ اپنے عزیز رشتہ دار اور پڑوسیوں کا بھی بہت خیال رکھتا تھا اور وقت پڑنے پر کھلے دل سے ان کی مدد بھی کرتا تھا۔بیکری کا دھندا جب بڑھنے لگا تو اس نے اپنے غریب رشتہ داروں کو بھی اپنے اس کام میں شامل کر لیا تھا۔اب اس کے ساتھ دس بارہ آدمی کام کرنے لگے تھے۔

بیکری کے سامنے کچھ ہی دوری پر ہنومان ٹیکری تھی جہاں ہنومان جی کا ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا۔ دن میں جہاں بھگت لوگ آتے اور اپنی شردھا کے مطابق پوجا ارچنا کے بعد کچھ روپئے پیسے کا چڑھاوا بھی چڑھاتے۔ مندر کی دیکھ ریکھ ایک پجاری کرتا تھا اور وہی چڑھاوا بھی لیتا تھا۔ شام ہوتے ہی مندر کے آس پاس گانجا، بھانگ، چرس اور شراب پینے والوں کی منڈلی جم جاتی کیونکہ اس جگہ سے کوئی اور اچھی جگہ ان لوگوں کو نہیں ملتی تھی۔ نشے کے عادی یہ لوگ کبھی کبھی تاش بھی کھیلتے اور آپس میں بری طرح لڑتے بھی تھے۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ سمیع اللہ جب کسی کو لڑتے جھگڑتے دیکھتا تو آکر بیچ بچاؤ کرتا اور انہیں سمجھا بجھا کر گھر بھیجتا۔ ہنومان مندر پر دھمال کرنے والوں میں ایک شخص مادھو بھی تھا۔ یہ آدمی نشے کے عادی لوگوں کو نشیلی چیزیں لاکر دیتا اور ان کے من مانے دام وصول کرتا۔

سمیع اللہ کو معلوم تھا کہ مادھو نشیلی چیزوں کا دھندا کرتا ہے۔ اس نے ایک دو بار مادھو کو سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ ''مادھو بھیّا۔ یہ آپ اچھا نہیں کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کی زندگی سے کھیلتے ہیں۔ ہنومان جی کے آس پاس تو پوتر تا کا واتاورن ہونا چاہئے آپ نے اسے کتنا گندا کر رکھا ہے؟ کچھ تو مندر کی مان مریادا کا خیال رکھنا چاہئے آپ کو۔''

مادھو سمیع اللہ کی بات ماننے کے بجائے اُسی پر ٹوٹ پڑتا۔ ''جا جا۔ اپنا کام کر..... یہ ہمارا مندر ہے..... ہم یہاں کچھ بھی کریں..... شراب پئیں، چلم کا دم لگائیں یا رنڈیوں کو نچائیں۔ تجھے اس سے کیا؟''

سمیع اللہ چپ چاپ اپنی بیکری کی طرف چل دیتا۔ مادھو کی نظریں بیکری پر جا کر ٹھہر جاتیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا۔ بہت چلتی ہے سالے کی بیکری۔ ایسی بیکری تو میرے پاس ہونا چاہئے۔ اس کا مالک تو مجھے بننا چاہئے۔ وہ کئی طرح کے منصوبے بنانے لگتا بیکری کو ہتھیانے کے لیے، لیکن اسے آخر میں اپنا ہر منصوبہ بے کار لگتا۔ وہ ہنومان جی کے مندر کے آس پاس نشے کی چیزیں بیچ کر ''ون ٹو کا فور'' کرتا رہتا اور مندر کے آس پاس کے ماحول کو گندا کرتا رہتا۔

اس دن گودھرا میں زبردست حادثہ ہو گیا تھا۔ پورا ملک سکتے میں تھا۔ ریل کے ایک ڈبے میں پچاس سے زیادہ آدمی، عورتیں اور بچے جل کر مر گئے تھے۔ الزام مسلمانوں پر تھا۔ انتقام کے جذبے سے تمام گجرات میں جگہ جگہ مسلمانوں کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔ احمد آباد، مہسانہ، نرودا پاٹیہ، گودھرا، داہود، سردار پور، بھڑوچ اور تمام گاؤں کھیڑے بھیانک آگ میں جل رہے تھے۔ ملک کی اربوں روپئے کی ملکیت آگ کی بھینٹ چڑھ رہی تھی۔ مادھو کی نظر میں سمیع اللہ کی بیکری تھی۔

موقع غنیمت تھا۔ اس نے اپنے تمام ہندو بھائیوں کو اکسایا۔ پلک جھپکتے ہی ڈیڑھ دو ہزار لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہوگئی۔ تلواریں، بھالے، جو جس کے ہاتھ میں آیا لے کر بھیڑ میں شامل ہوگیا۔ بھیڑ میں سب سے آگے مادھو تھا جو سمیع اللہ کی بیکری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دور سے سمیع اللہ نے بیکری سے کھڑے ہوکر بھیڑ کو دیکھا وہ اس کی طرف ہی آرہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے۔ موت مادھو کی شکل میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے بھیڑ کے ہر آدمی کا چہرہ مادھو کا چہرہ ہے۔ اس کے آگے ہزاروں مادھو کھڑے تھے جو ہنومان ٹیکری پر مندر کے آنگن میں لوگوں کو زہر بیچ رہے تھے۔ اب یہ ہزاروں مادھو اسے زہر دینے کے لیے کالے ناگ کی طرح اس کی طرف تیزی سے آرہے تھے۔

سمیع اللہ کو ایک کہانی یاد آگئی جسے اس کی ماں نے اسے بچپن میں سنائی تھی۔ جنگل میں ایک چڑیا ہوتی ہے جسے لوگ بیا کہتے ہیں۔ بیا اپنے لیے بڑا ہی خوبصورت گھونسلہ بناتی ہے جو پیڑوں پر اون کی ٹوپیوں کی شکل میں شاخوں پر لٹکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس گھونسلے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں بیا اپنے سونے، بیٹھنے، دانہ جمع کرنے اور سنڈاس کے لیے الگ الگ کمرے بناتی ہے۔ ایک بار جب بارش میں اس نے بندر کو بھیگتے ہوئے دیکھا تو اس پر ترس کھا کر کہا۔ ''تم تو انسان کی طرح ہو، میری طرح کیا اپنے لیے ایک چھوٹا سا گھر نہیں بنا سکتے؟ تاکہ بارش میں بھیگنے سے بچ سکو۔'' بندر کو بیا کی سیکھ پر غصہ آگیا اور اس نے پیڑ کی ڈال پر چھلانگ لگا کر اس کا گھونسلہ ہی نوچ کر پھینک دیا۔ سمیع اللہ کو یقین ہوگیا کہ آج اس کا گھونسلہ، اس کی بیکری، اس کے خاندان کی زندگیاں سب کچھ ہزاروں مادھو جیسے بندروں کا ٹولہ نوچ کر پھینک دے گا۔

اس وقت سمیع اللہ کے گھر اور بیکری میں آدمی، عورتیں اور بچے سب ملا کر بیس افراد تھے۔ سب کو اپنی جان بچانے کی پڑی تھی لیکن اب اتنا وقت کہاں تھا کہ موت کے پنجے سے نکل کر کوئی بھاگ سکتا۔ بھیڑ بیکری پر آگئی تھی۔ پہلے جنونی لوگوں نے دو معصوم جڑواں بہنوں کے بدن پر پٹرول ڈالا اور آگ لگادی۔ یہ سمیع اللہ کی سالی کی خوبصورت بچیاں تھیں۔ دونوں جاپانی گڑیا کی طرح جل رہی تھیں۔ اور دو ہزار لوگوں کی جنگلی بھیڑ تالیاں بجا بجا کر ناچ رہی تھی۔ کتنے سور ماتھے یہ لوگ جو دو معصوم سی بچیوں کو جلا کر فتح کا جشن منا رہے تھے۔ اب باری تھی ایک ساڑھے چار سال کے بچے کی۔ اسے دو ہزار سور ماؤں نے اسی طرح جلا کر فتح کا پرچم لہرایا۔ پھر ایک ایک کر کے چودہ انسانوں کو زندہ جلایا گیا۔ ان میں وہ بیکری والا کاریگر بھی تھا جس کے ہاتھوں کی ڈبل روٹیاں، ٹوس، بسکٹ، کھاری اور نان کے شہرے کے لوگ دیوانے تھے۔ دور چھت کی اوٹ میں چھپی سمیع اللہ کی

بیوی مہرالنساء اور بیٹی زاہدہ اپنے خاندان کے لوگوں کو سرِعام زندہ جلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی چیخیں اندر ہی اندر سینوں میں اس لیے گھٹ کر رہ جاتی تھیں کہ اگر وہ کسی کو سنائی دیتیں تو ساری بھیڑ اُنہیں بھی زندہ جلانے سے نہیں چوکتی۔

سمیع اللہ کی بیکری ٹھنڈی پڑی تھی۔ لوگوں کے ناشتہ میں اب وہ ذائقے دار ٹوس اور ڈبل روٹیاں نہیں تھیں۔ ان کی صبح کی شروعات بے مزہ ہو کر رہ گئی تھی۔ مادھو کی بیوی پریشان تھی۔ اس کے بچے رو رو کر بیکری کی ڈبل روٹیاں اور ٹوس مانگ رہے تھے۔ خود مادھو کا بھی کئی دنوں سے منہ خراب تھا۔ وہ جب تک دو ڈبل روٹیاں دودھ میں بھگو کر نہیں کھالیتا تھا اسے ناشتہ کا مزہ ہی نہیں آتا تھا۔

بہت دنوں کے بعد زاہدہ اور مہرالنساء کی نشاندہی پر پولس نے بیکری پر چودہ لوگوں کو زندہ جلانے کے جرم میں کئی لوگوں کو گرفتار کرلیا تھا۔ مادھو اب بھی آزاد تھا۔ صوبے میں ہونے والے انتخاب میں وہ بھاری اکثریت سے جیت کر ایم ایل اے بن گیا تھا۔ اب وہ سرکار میں تھا ''جب سیّاں بھئے کوتوال تو ڈر کا ہے کا۔'' مادھو اب شہر کا بڑا آدمی بن گیا تھا۔ اس کا دھندا زوروں پر چل نکلا تھا۔ گاڑی، بنگلہ، نوکر، چاکر سب ہو گئے تھے۔ لیکن سمیع اللہ کی بیکری کی دودھ میں بھگوئی ہوئی ڈبل روٹیوں کا ذائقہ اسے کہیں نہیں مل رہا تھا۔

مادھو نے تمام گواہوں کے بیان دھونس دپٹ دے کر بدلوا دیئے تھے۔ مہرالنساء اور زاہدہ جو چشم دید گواہ تھیں انھوں نے بھی مادھو کی جان سے مار دینے کی دھمکی کے ڈر سے جج کے سامنے کہہ دیا تھا کہ ''انہوں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا۔''

فیصلہ ہوا تو تمام گنہگار باعزت بری ہو گئے تھے۔ ٹی وی پر جب یہ خبر نشر ہوئی تو ملک کے سوکر وڑ لوگ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ اگر یہ سب لوگ بے گناہ ہیں تو ان چودہ لوگوں کو زندہ جلانے والے کون تھے؟ کیا ان مجرموں کو عدالت پکڑ کر سزا دے گی؟ یا پھر یہ فیصلہ اور ایسے کئی فیصلے عدالت سے لوگوں کا اعتماد اٹھانے کا سلسلہ بنتے رہیں گے؟

سمیع اللہ کی بیکری مادھو نے اپنے ایک قریبی دوست کو چلانے کے لیے دلا دی ہے۔ تندور گرم ہو گیا ہے۔ ڈبل روٹی، ٹوس، بسکٹ، کھاری اور نان سب کچھ بننے لگے ہیں لیکن ان چیزوں میں وہ پہلے جیسا ذائقہ نہیں ہے، سارا شہر جس کا عادی بن چکا تھا۔ شہر کے ننھے منے بچے وہی ڈبل روٹی، ٹوس اور بسکٹ مانگ رہے ہیں۔ اُنہیں نہیں معلوم ان چیزوں کو بنانے والا اب کوئی نہیں ہے۔

☆☆

پروفیسر عبدالواسع

تجزیہ — بیکری

ابراہیم اشک اُردو کے معروف ومقبول افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانے اُردو کے معیاری رسائل میں شائع ہوتے ہیں اور گہری معنویت وطرز ادا کے حامل ہوتے ہیں۔افسانہ ''بیکری'' بھی بہت پرتاثیر اور اہم موضوع پر لکھا گیا ہے اور وہ موضوع ہے ہندو مسلم فساد۔

ہندوستان جنت نشان میں صدیوں سے مختلف مذاہب، رنگ ونسل کے لوگ بودوباش کرتے ہیں اور آپس میں شیروشکر ہوکر رہتے ہیں مگر سات سمندر پار سے آئے بھیڑیوں نے اتحاد و اتفاق کی قبا کو تار تار کر دیا ہے۔نفرت ونفاق کی وہ فضا قائم کی جس کے اثرات ہنوز باقی ہیں اور سماج میں ناسور کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ یہ ایک سبق آموز امر ہے کہ سات سمندر پار سے آئے بھیڑئے تجارت کی غرض سے ہندوستان میں آئے لیکن مقامی راجوں، نوابوں اور بادشاہوں کی مہمان نوازی، احسان شناسی اور اخلاص کے عوض سارے ملک پر قابض ودخیل ہونے کا خواب دیکھنے لگے بلکہ اپنی عیاری، بہانہ جوئی اور ناپاک ارادوں کی تکمیل میں دل وجان سے لگ گئے چنانچہ رفتہ رفتہ ملک کے حکمرانوں کو معزول کر کے لال قلعہ پر قابض ہو گئے اور وہاں سے ملک کے اتحاد واتفاق کے تانے بانے کو توڑ دیا جس کے نتیجے میں ان شیطانوں کے واپس جانے تک ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اس کے آسمان پر نفرت ونفاق کے بادل چھا گئے۔تب سے فسادات کا سلسلہ قائم ہے جو رکنے کا نام نہیں لیتا۔ یہ فسادات کبھی مذہب کے نام پر ہوتے ہیں کبھی ذات کے نام پر، کبھی زبان کے نام پر مگر سب سے بھیانک ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں۔ابراہیم اشک کے افسانہ'' بیکری'' کا موضوع بھی یہی ہے۔ یہ عرض کرنا بے جانہ ہوگا کہ اس موضوع پر اُردو کے مایہ ناز افسانہ نگاروں نے خامہ فرسائی کی ہے میری مراد کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور منٹو سے ہے مگر ان عظیم افسانہ نگاروں کے افسانوں اور ابراہیم اشک کے افسانہ'' بیکری'' میں ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ ان قلمکاروں کے افسانے ہندو مسلم فسادات پر مبنی ہیں جبکہ'' بیکری' کا موضوع ہندو مسلم فساد

سے گزر کر معاشی بنیاد پر مبنی ہے، جس کا اظہار بندر اور ''بیا'' چڑیا کے قصے سے ہوتا ہے۔ اس افسانے میں ہندو مسلم فساد ذریعہ ہے جبکہ سمیع اللہ کی بیکری، پر قبضہ کرنا منزل مقصود ہے۔ دراصل یہ افسانہ گجرات کے فسادات میں Wellcome Bakery کے توڑ پھوڑ کرنے اور لوگوں کو زندہ جلانے کے سچے واقعے پر مبنی ہے اور جگہ جگہ افسانے کو پڑھتے ہوئے اس کی یاد تازہ ہو جاتی ہیں۔

سمیع اللہ کی ''بیکری'' جہاں تھی اس سے ذرا ہٹ کے ہنومان مندر تھا جو ہنومان ٹیکری کے نام سے مشہور تھا۔ ہنومان کے عقیدتمند دن میں وہاں جا کر اپنی شردھا کا اظہار کرتے، پوجا پاٹ کرتے اور چلے جاتے مگر شام ہوتے ہی جواریوں، نشیڑیوں اور دوسرے اوباشوں کا جمگھٹ لگ جاتا جو کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں الجھ جاتے اور لڑنے جھگڑنے لگتے۔ مادھو انہیں نشہ آور اشیا پہنچایا کرتا تھا اور اپنی کمائی کرتا تھا۔ اس کے برعکس سمیع اللہ ان کے درمیان بیچ بچاؤ کراتا اور اسی عمل میں مادھو کو نصیحت کرتا کہ مندر جیسے مقدس مقام میں نشہ آور چیزیں فروخت کرنا بند کر دے کیونکہ اس سے پاپ لگتا ہے۔ مگر مادھو پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ فی الواقع سمیع اللہ اور مادھو افسانے کے دو اہم کردار ہیں اور دو ذہنیت کو پیش کرتے ہیں۔ سمیع اللہ عام شہری ہے جو ملک میں امن و آمان کا خواہاں ہے۔ وہ نیک دل انسان ہے۔ منافع خوری اس کی عادت نہیں ہے۔ لوگوں کی مدد کرنا اس کی فطرت میں شامل ہے مگر مسلمان ہے۔ اس لئے ہندو راشٹر وادیوں کے لئے وہ قابل قبول نہیں ہے جبکہ مادھو حریص ہے۔ جائز ناجائز ہر طریقے سے دولت کمانا اس کا مدعا ہے اور اپنے مقصد کے حصول میں ہندو راشٹر وادی ذہنیت کو فروغ دینے سے بھی نہیں چوکتا چنانچہ سمیع اللہ کی نصیحت کا خاطر خواہ اثر اس پر نہیں ہوتا، الٹا وہ سمیع اللہ سے جھگڑتا اور دل میں کینہ پالتا ہے۔ اس کی نظر سمیع اللہ کی ''بیکری'' پر ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح بندر کی نظر ''بیا'' چڑیا کے گھونسلے پر تھی اور اس نے اس کو نوچ کر پھینک دیا تھا۔

> ''سمیع اللہ چپ چاپ اپنی بیکری کی طرف چل دیتا۔ مادھو کی نظریں بیکری پر جا کر ٹھہر جاتیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا۔ بہت چلتی ہے سالے کی بیکری۔ ایسی بیکری تو میرے پاس ہونی چاہئے۔ اس کا مالک تو مجھے بننا چاہیے۔ وہ کئی طرح کے منصوبے بنانے لگتا بیکری کو ہتھیانے کے لئے۔''

اتفاق سے مادھو کو اپنے ناپاک ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ گودھرا میں ایک ٹرین کے دو ڈبوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ متعدد تیرتھ یاتری مر جاتے ہیں۔ الزام مسلمانوں کے سر آ جاتا ہے اور سارے گجرات میں ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑک جاتی ہے۔

اس کو اپنے لئے سنہری موقع جانتے ہوئے مادھو ہندوؤں کو اکٹھا کرتا ہے اور کئی ہزار افراد ''بیکری'' بردھاوا بول دیتے ہیں۔ ''بیکری'' کے مالک، ''بیکری'' کے کاریگر جو ذائقہ دار ٹوس، بسکٹ، روٹیاں، کھار بناتا تھا اور دو معصوم بچیوں سمیت چودہ افراد کو زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ دل دہلانے والا یہ منظر سمیع اللہ کی بیوی زاہدہ اور بیٹی مہر النساء ایک چھت سے دیکھتی ہے مگر آہ تک نہیں کرتی کیونکہ بلوائی انہیں دیکھ لیتے اور پھر ان کا حشر بھی وہی ہوتا جو اس کے شوہر اور دوسرے رشتہ داروں کا ہوا تھا۔ اگر چہ یہ وہی بیکری تھی جس کی بنی چیزوں کا عادی سارا شہر ہو چکا تھا کیا ہندو کیا مسلمان:

> ''ڈبل روٹی اور ٹوس کے علاوہ سمیع اللہ طرح طرح کے بسکٹ بھی بناتا تھا..... یہ بسکٹ عام گھروں میں ڈبوں میں بھرے ہوتے یا پھر شیشے کے برتنوں میں سجے ہوتے تھے۔ جب بھی گھر میں کوئی مہمان آتا چائے کے ساتھ بھلے گھر کی عورتیں یہ بسکٹ بڑے جتن سے پلیٹوں میں سجا کر رکھتیں اور اپنے سگھڑ ہونے کا ثبوت دیتیں۔''

سمیع اللہ کی ''بیکری'' کے بنے بسکٹ، ڈبل روٹی، ٹوس، کھاری اور نان بہت ذائقہ دار ہوتے تھے۔ عام دنوں کے علاوہ لوگ شادی بیاہ میں بھی ان کا استعمال مہمانوں کی خاطر تواضع میں کرتے تھے۔ بچے تو ان کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ نہ ملے تو بڑوں کی ناک میں دم کرتے تھے:

> ''شہر کے تمام لوگ اس کی بیکری میں بننے والی ڈبل روٹی، ٹوس کے ناشتے سے اپنے دن کا آغاز کرتے تھے۔ بچے چائے اور دودھ میں بھگو کر انہیں بڑے مزے سے کھاتے۔ اگر کبھی ناشتے میں یہ چیزیں نہیں ملتیں تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا۔ بچے تو رو رو کر ماں باپ کی ناک میں دم کر دیتے تھے۔''

سمیع اللہ ایک نیک دل اور خدا ترس انسان تھا۔ اس کی ''بیکری'' کا کاروبار بڑھ گیا تو اس نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو بلا کر اس میں کام میں لگا دیا۔ پھر اس نے اپنی بنائی چیزوں کی مانگ کے بڑھنے پر بھی ان کے دام نہیں بڑھائے کیونکہ وہ مناسب نفع کمانے میں یقین رکھتا تھا۔ وہ سچا اور پکا مسلمان تھا مگر ہندوستان میں رہتا تھا جہاں مادھو جیسے ہندو راشٹریہ واد کا نعرہ لگانے والے لوگ موجود تھے جو اس کی ''بیکری'' کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے:

> ''اس نے کبھی نہیں سوچا کہ وہ ان چیزوں کی مقبولیت سے بے جا فائدہ اٹھائے، قیمتیں بڑھائے اور ناجائز طور پر عوام سے روپے اینٹھے۔ سمیع اللہ سچا مسلمان تھا اور اپنے دھندے میں وہ مناسب روپیہ کمانے میں یقین رکھتا تھا۔

انتساب

کرم فرما

مصطفیٰ خاں

(ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

کے نام

اس لئے خدا نے اس کے دھندے میں برکت دے رکھی تھی۔ وہ اپنے عزیز رشتہ داروں اور پڑوسیوں کا بھی بہت خیال رکھتا تھا اور وقت پڑنے پر کھلے دل سے ان کی مدد بھی کرتا تھا۔''

مگر جب حاکم کی نیت بری ہو تو دلیل وحجت کام نہیں آتی۔ سمیع اللہ کی اچھائی، پاس پڑوس کے لوگوں کی مدد کرنا، اس کی '' بیکری'' کی ذائقہ دار چیزوں کا مناسب دام میں ملنا وغیرہ کا اثر مادھو اور اس کے بلوائی ساتھیوں پر ایک ذرا نہیں ہوا کیونکہ وہ انسان سے حیوان ہو گئے تھے۔ ان کے دل میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ '' بیکری'' ان کی زندگی میں رچ بس گئی ہے۔ اس کی بنی کھاری، نان، ٹوس اور بسکٹ کے سب عادی ہو گئے ہیں۔ اس کے ختم ہونے سے ان کی زندگی میں فرق پیدا ہو جائے گا اور ان کی زندگی کے رنگ پھیکے پڑ جائیں گے۔ یہ اس لئے ہوا تھا کہ مادھو کے ذریعے پھیلائے گئے بغض وعناد نے انہیں شیطان بنا دیا تھا اور وہ تانڈو ناچ کر رہے تھے۔ بربادی کا ناچ، '' بیکری'' کی بربادی کا ناچ کیونکہ '' بیکری'' پر مادھو کو قبضہ کرنا تھا جس کے لئے برسوں سے اس کے دل میں حرص وہوس کے ناگ پھن پھیلائے بیٹھے تھے۔ عام لوگ مادھو کے اشتعال دلانے پر مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے '' بیکری'' کو نیست ونابود کر دیا۔ کشت وخون کا بازار گرم کیا۔ حیوانیت کا ننگا ناچ کیا۔ سمیع اللہ اور اس کے خانوادے کے چودہ افراد کو زندہ جلا دیا۔ ان میں دو معصوم بچیاں اور '' بیکری'' کا کاریگر بھی شامل تھا جو ذائقہ دار بسکٹ، روٹیاں، ٹوس اور کھاری بناتا تھا جسے شہر والے بہت پسند کرتے تھے اور بچے بوڑھے سب اس کے عادی ہو گئے تھے۔ فساد کا زور ٹوٹا اور شہر میں سکون ہوا تو لوگ سمیع اللہ کی '' بیکری'' کی روٹیاں، ٹوس، بسکٹ اور کھاری کے خواہاں ہوئے مگر یہ اب نایاب تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر والوں کی زندگیوں میں فرق پیدا ہو گیا۔ خود مادھو کو ناشتے میں وہ مزہ نہیں مل رہا تھا جو سمیع اللہ کی '' بیکری'' کی روٹیوں کو دودھ میں بھگو کر کھانے میں ملتا تھا۔ فساد کے بعد بے شمار دولت اکٹھی کرنے اور اقتدار کی کرسی پر فائز ہونے کے باوجود وہ اس لذت سے محروم تھا کیونکہ خود کردہ را علاج نیست:

> '' سمیع اللہ کی بیکری ٹھنڈی پڑی تھی۔ لوگوں کے ناشتے میں اب وہ ذائقے دار ٹوس اور ڈبل روٹیاں نہیں تھیں۔ ان کی صبح کی شروعات بے مزہ ہو کر رہ گئی تھی۔ مادھو کی بیوی پریشان تھی۔ اس کے بچے رو رو کر بیکری کی ڈبل روٹیاں اور ٹوس مانگ رہے تھے۔ خود مادھو کا بھی کئی دنوں سے منہ خراب تھا۔ وہ جب تک دو ڈبل روٹیاں دودھ میں بھگو کر نہیں کھا لیتا تھا اسے ناشتہ کا مزہ ہی نہیں آتا تھا۔''

انسان انسان کے منصب سے گر کر شیطان ہو جاتا ہے تو اپنے فائدے کا خیال بھی نہیں رکھتا سمیع اللہ اور اس کی بیکری کو نیست و نابود کر کے مادھو نے بھی یہی کیا تھا کیونکہ یہ مادھو وہ مادھو نہیں تھا جو غلام ہندوستان میں صلح و آشتی کا مظہر تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ تھوڑے میں خوش تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہندو راشٹروادی مسلمانوں کو معاشی طور پر اتنا کمزور کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے کام کریں اور سماج کے سب سے نچلے طبقے کی جگہ لے لیں۔ سمیع اللہ کی ''بیکری'' کو نذر آتش کرنے کے پیچھے بھی یہ فلسفہ کارفرما ہو سکتا ہے مگر مجھے مادھو کی حریص نگاہیں زیادہ ذمہ دار معلوم ہوتی ہیں جو ابتدا سے ''بیکری'' پر مثل چیل گڑی تھیں۔ اسی وجہ کر ''بیکری'' پر قبضہ جمانے کے لئے مادھو نے سارے شہر کے امن و آمان کو خطرے میں ڈالا، فساد کی آگ بھڑکائی۔ سمیع اللہ کے چودہ افراد خانہ کو زندہ جلایا اور صلے میں انتخاب لڑ کر برسر اقتدار پارٹی کا ایم ایل اے ہو گیا۔ ایم ایل اے ہونے کے بعد بارسوخ ہو گیا اور سمیع اللہ کی بیوی زاہدہ اور اس کی بیٹی مہر النسا کو ڈرا دھمکا کر تمام مقدموں کو خارج کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ گجرات میں آج زاہدہ کی شکل میں کتنی ہی بلقیسیں انصاف کی دہائی دے رہی ہیں۔ مادھو نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ''بیکری'' کو جو کبھی سمیع اللہ کی ملکیت تھی، چلانے کی ذمہ داری اپنے ایک قریبی دوست کو دے دی۔ ''بیکری'' از سر نو کھل گئی۔ ڈبل روٹیاں، ٹوس، بسکٹ، کھاری سب بننے لگے مگر ان میں وہ ذائقہ نہیں پیدا ہوا جو سمیع اللہ کی ''بیکری'' کی بنائی ہوئی چیزوں میں تھا۔ ذائقہ آتا بھی تو کیسے آتا ذائقہ بھرنے والے کاریگر کو تو ہندو راشٹروادی متعصب حریصوں نے نذر آتش کر دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جمہوریہ ہند کے جمہوری نظام حکومت میں رنگ مسلمان ہی بھرتے ہیں۔ انہی کے دم سے جمہوریہ ہند کا پرچم سارے عالم میں لہرا رہا ہے۔ اگر انہیں نکال دیا جائے تو دنیا میں سب سے بڑی جمہوریت کا تاج ہندوستان کے سر سے اتر جائے گا۔ مگر حرص و ہوس والے یہ باتیں کب خیال میں لاتے ہیں، وہ تو بس ذاتی اور وقتی فائدے کو پیش نظر رکھتے ہیں:

> ''ڈبل روٹی، ٹوس، بسکٹ، کھاری اور نان سب کچھ بننے لگے ہیں لیکن ان چیزوں میں وہ پہلے جیسا ذائقہ نہیں ہے سارا شہر جس کا عادی ہو چکا تھا۔ شہر کے ننھے منے بچے وہی ڈبل روٹی ٹوس اور بسکٹ کی مانگ کر رہے ہیں۔ انہیں نہیں معلوم ان چیزوں کو بنانے والا اب کوئی نہیں ہے۔''

ابراہیم اشک کا لکھا افسانہ ''بیکری'' یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ جمہوریہ ہند کی عدالتوں کا ایک نقشہ بھی پیش کرتا ہے جو عام طور سے ہندو مسلم فساد کے موقع پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ فساد ختم ہونے

کے بہت دنوں کے بعد سمیع اللہ کی بیوی زاہدہ اور اس کی بیٹی مہرالنساء کی نشاندہی پر پولس نے کئی لوگوں کو گرفتار کرلیا اور مقدمے چلائے مگر تب تک مادھو برسر اقتدار پارٹی کا ایم ایل اے ہوگیا تھا اور اپنے رسوخ کا استعمال کر کے تمام مقدموں کو خارج کرانے میں کامیاب ہوگیا کیونکہ عدالتوں میں ثبوت وشواہد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس المناک واقعے کا کوئی عینی شاہد نہیں ملا جبکہ زاہدہ اور مہرالنساء نے خود اپنی آنکھوں سے سارے واقعے کو دیکھا تھا مگر دونوں اقتدار کی دھونس کے آگے مجبور محض تھیں اور حق نہیں بول سکتی تھیں، ان کے منہ پر زور اور زر کے تالے پڑے تھے جیسے بلقیس کے منہ پر پڑے ہیں، گویا زاہدہ اور مہرالنسا کے جسد خاکی میں بلقیس کی روح حلول کر گئی تھی۔

اس مقام پر میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ ملک گیر پیمانے پر ہمارے ارکان قانون ساز یہ، سیاستدانوں اور وزرا کی اکثریت اسی پس منظر سے آتی ہے جو مادھو کا پس منظر تھا۔ ایسے افراد صحیح اور غلط کا کوئی پیمانہ نہیں رکھتے۔ ہمیشہ اپنے فائدے کی باتیں سوچتے ہیں چاہے وہ انسانوں کی لاشوں کی سوداگری سے چلیں، پارلیامنٹ میں پیسے لے لے کر کسی سوال کو اٹھانا، کسی Issue کو دبانا، ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں جانا، آیا رام گیا رام بننا وغیرہ اس کی روشن مثالیں ہیں۔ جب تک یہ صورتحال ہوگی ملک میں جمہوری اقتدار کی جڑیں پائدار نہیں ہوں گی۔ امن وآمان بحال نہیں ہوگا۔ انتشار وفساد کا دور دورہ ہوگا اور عام انسان اس چکی میں پستا رہے گا، کیونکہ حق وانصاف کی آواز بلند کرنے والوں کی آواز دبادی جاتی ہے۔ انہیں یا تو جام شہادت نوش کرنا پڑتا ہے یا اپنے بیان کو واپس لینے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اس دور کی واضح مثال اے ٹی ایس چیف کر کرے اور ان کی شہادت پر عدالتی جانچ کرانے کی درخواست کرنے والے مرکزی وزیر امور اقلیتی فلاح و بہبود ہے۔ آرانتو لے ہیں جن کے ساتھ جو ہوا دنیا نے دیکھا۔ ان حالات میں ہم جو کر سکتے ہیں وہ بس یہ ہے کہ اللہ سے دعا کریں کہ مادھو جیسے لوگوں کو عقل سلیم دیں یا اس جیسے لوگوں کو اقتدار اور حکومت کے مرکزی مقام پر مسند نشین نہ کریں۔ آمین ثم آمین۔ میرے نزدیک اس افسانے کا پیغام یہی ہے۔

وتعزُ من تشاءُ وتذلُ من تشاء.

رہے نام اللہ کا۔ اللہ بس باقی ہوس

Karar ki Bari, Chandwara
Muzaffarpur-842001

☆☆

ماں

عظیم بھائی اپنی بیوی صغرہ کے ساتھ اجمیر شریف خواجہ غریب نواز کی درگاہ پر حاضری دینے کے لیے جانے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ عرس کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ تلسی صغرہ کی اچھی سہیلی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے دل کی بات کہہ دیا کرتی تھیں۔ تلسی کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی کا نام لکشمی تھا اور چھوٹی کا پاروتی۔ اب اسے ایک بیٹے کی ضرورت تھی جس کے لیے وہ بڑی مان مرادیں کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ صغرہ نے تلسی کو بتایا کہ خواجہ صاحب کی درگاہ پر سچے دل سے جو بھی مراد مانگی جاتی ہے وہ پوری ہوتی ہے۔ تلسی نے سوچا کیوں نہ وہ بھی خواجہ صاحب کی درگاہ پر جا کر اپنے لیے ان سے ایک بیٹا مانگ لے۔ اس نے بھی صغرہ کے ساتھ اجمیر جانے کا فوراً پروگرام بنالیا۔ تلسی نے خواجہ غریب نواز سے جھولی پھیلا کر بیٹا مانگا تھا، خواجہ صاحب نے اس کی گود بھر دی تھی۔ اس بار اس نے بیٹے ہی کو جنم دیا تھا۔ بیٹے کے نام کرن کی جب رسم ہونے لگی تو تلسی نے اپنے بیٹے کا نام دیواشیش رکھا جو اسے دیو یعنی خواجہ صاحب کے آشیش سے ملا تھا۔

تلسی کا آدمی شراب کے ٹھیکے پر کام کرتا تھا۔ اس لیے اسے شراب پینے کی لت لگ گئی تھی۔ تلسی نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ شراب چھوڑ دے لیکن اس نے پینا نہیں چھوڑا۔ دیسی ٹھرا روز پینے کی وجہ سے اس کا جگر سڑنے لگا۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا جب تلسی کا پتی اپنے تین بچوں کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے اسے اس دنیا میں بے سہارا چھوڑ کر پرلوک سدھار گیا۔ تلسی کو ایسا لگا جیسے سارے سنسار میں اندھیرا چھا گیا ہو۔ دیواشیش ابھی پانچ سال ہی کا تھا، پاروتی نو سال کی تھی اور لکشمی تیرہ سال کی ہوگئی تھی۔ تلسی کو اپنی زندگی کا ایک ایک پل پہاڑ کی طرح لگنے لگا تھا، لیکن وہ ہمت والی عورت تھی اس نے سوچ لیا تھا کہ محنت مزدوری کر کے وہ اپنے بچوں کی پرورش کرے گی۔ دیواشیش کو وہ پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنائے گی۔

دیواشیش کو تلسی نے اسکول میں داخل کر دیا تھا اور خود مکان بنانے والے ایک کاریگر

کے ساتھ مزدوری کرنے لگی، دن بھر وہ ریت اور سیمنٹ سے بھری کگاریاں اٹھاتی، رات کو جب گھر پہنچتی تو تھک کر چور ہو جاتی تھی۔ لکشمی ہوشیار تھی وہ گھر کا سارا کام کر لیتی تھی۔ اتنا ہی نہیں ایک ڈاکٹر کے یہاں اس نے برتن مانجھنے کا کام بھی پکڑ لیا تھا۔ صبح شام وہ پاروتی کو اپنے ساتھ لے کر ڈاکٹر صاحب کے یہاں جاتی اور دونوں بہنیں مل کر جلدی جلدی سارے برتن صاف کر دیا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی ان کے کام سے بہت خوش تھی۔ جب سے لکشمی نے یہ کام پکڑا تھا تلسی کو ایسا لگنے لگا تھا جیسے اس کا جوان بیٹا کمانے لگ گیا ہے۔ اس کا دکھ کم ہونے لگا تھا اور سکھ کے جھونکے اس کے گھر آنگن میں آنے لگے تھے۔ تلسی اپنے بچوں کے ساتھ بہت خوش رہنے لگی تھی۔

اب تلسی کے پاس کچھ روپے پیسے بھی ہو گئے تھے۔ کچے مکان کی جگہ اب اس نے دو منزلہ پکا مکان بنالیا تھا۔ لکشمی اور پاروتی کی شادی اس نے بڑی دھوم دھام سے کی تھی۔ دونوں بیٹیاں اپنے گھروں میں سکھ سے زندگی گزار رہی تھیں۔ تلسی نے دیواشیش کو راجہ بابو کی طرح پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ اسے کسی طرح کی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ یہاں تک کہ ماں کے ساتھ ساتھ باپ کا پیار بھی اسے دیا تھا۔ تلسی کی عمر پچاس برس سے اوپر ہو گئی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے اب اس سے محنت مزدوری نہیں ہوتی تھی اسی لیے زیادہ تر وہ گھر ہی پر رہتی تھی۔

دیواشیش نے ایم اے پاس کر لیا تھا۔ تلسی نے اپنے نگر کے بڑے نیتا کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر بیٹے کو اسکول ماسٹر بنوا دیا تھا۔ اب تلسی کو ایک ہی چنتا تھی یعنی دیواشیش کی شادی۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے خوبصورت اور پڑھی لکھی بہو لانا چاہتی تھی۔ کئی جگہ سے رشتے کی باتیں آئی تھیں لیکن تلسی کو اپنے بیٹے کے لیے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی۔

ایک دن دیواشیش ایک نوجوان لڑکی کو گھر لے کر آیا اور تلسی سے اس کا پریچے کراتے ہوئے بولا ''ماں یہ سلکھشنا ہے۔ میرے ساتھ اسکول میں ٹیچر ہے۔ ہم دونوں نے کورٹ میرج کر لی ہے۔ اب یہ یہیں رہے گی۔''

تلسی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان گونگی اور کان بہرے ہو گئے تھے۔ نہ جانے کتنے ارمان سنجو رکھے تھے اس نے دیواشیش کی شادی کے جو ایک پل میں سب بکھر کر رہ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں جی بھر کر رونا چاہتی تھیں لیکن آنسو سوکھ گئے تھے۔ اس نے سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کا لاڈلا بیٹا اس سے پوچھے اور بتائے بغیر اتنا بڑا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ دنگ سی چپ چاپ کھڑی رہ گئی جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ سلکھشنا اور دیواشیش نے نہ تو تلسی کے پاؤں چھوئے نہ

آشیرواد لیا۔ وہ آگے بڑھ کر سلکھشنا کو گلے سے لگانا چاہتی تھی آشیرواد دینا چاہتی تھی لیکن اس کا سارا بدن پتھر کا بن کر رہ گیا تھا۔

دیواشیش کے الفاظ پھر تلسی کے کانوں میں گونجنے لگے ''ماں، ہمارے لیے کھانا بنادو، بہت بھوک لگی ہے، کھانا بن جائے تو ہمیں آواز دے دینا۔ سلکھشنا اور میں تب تک اوپر والے کمرے میں ہیں۔'' وہ سلکھشنا کا ہاتھ تھام کر اوپر چلا گیا اور تلسی گھر کی نوکرانی کی طرح کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی۔

سلکھشنا کے پیار میں دیواشیش ماں کی ممتا کو بھولتا جارہا تھا، تلسی کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کی زندگی بھر کی پونجی کسی نے ڈاکہ ڈال کر ہڑپ لی ہے اور اسے اپنے گھر کی نوکرانی بنالیا ہے۔ اس کا گھر سنسار اجڑ گیا ہے اور اس کا سارا استھو بکھر گیا ہے۔ ایسی تو وہ اپنے پتی کی موت کے وقت نہیں بکھری تھی۔ اس بار یوں بکھری ہے جیسے دوبارہ خود کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔

بیٹا، بہو کے کپڑے دھوتے، برتن صاف کرتے، کھانا بناتے اور ہر طرح سے ان کی غلامی کرتے ہوئے تلسی جلد ہی گھبرا گئی۔ یہ گھبراہٹ ایسی تھی کہ وہ اپنے ہی گھر سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا وہ اپنی بڑی بیٹی لکشمی کے یہاں چلی جائے گی۔ دوسرے ہی دن جب دیواشیش اور سلکھشنا اسکول چلے گئے تو تلسی نے ایک پوٹلی میں اپنے تھوڑے سے کپڑے باندھے اور بس اسٹاپ کی اور چل دی۔ گھر کی چابی اس نے پڑوسی کو دے دی تھی تاکہ شام کو جب اسکول سے دیواشیش اور سلکھشنا آئیں تو انہیں دے دے۔

ایک مہینہ وہ لکشمی کے یہاں رہی۔ دن بھر لکشمی کے بچے اسے نانی نانی کہہ کر گھیرے رہتے۔ داماد ان کا بیٹے سے زیادہ خیال رکھتا تھا۔ اس کا سلوک دیکھ دیکھ کر تلسی کو اپنے سگے بیٹے دیواشیش کی یاد آجاتی اور تب اس کا دل بھر آتا تھا، آنکھیں چھلک جاتی تھیں۔ لکشمی بھی اپنی ماں کا دل ہتھیلی میں رکھتی تھی۔ تلسی اسے دیکھ کر سوچتی کاش یہ میری بیٹی نہ ہوتی بیٹا ہوتی تو آج اسے یہ دن نہیں دیکھنا پڑتے۔

لکشمی کے یہاں ایک مہینہ گزار کر تلسی پاروتی کے یہاں چلی گئی تھی۔ پاروتی کا پتی بھی بھلا آدمی تھا۔ اپنی ساس کا وہ ماں سے زیادہ خیال رکھتا تھا۔ ایک دن پاروتی نے اکیلے میں ماں کے دل کی بات جاننا چاہی تو وہ پھوٹ پڑی اور دیواشیش اور سلکھشنا کے سلوک کے بارے میں سب کچھ رو رو کر بتادیا۔ پاروتی کو بہت غصہ آیا وہ اسی وقت تلسی کو لے کر دیواشیش کو سبق سکھانے کے لیے جانا چاہتی تھی لیکن ماں نے اسے سمجھا بجھا کر شانت کر دیا۔

دو مہینے ہو گئے تھے تلسی کو دیواشیش سے دور رہتے ہوئے۔ بچپن سے اب تک اس نے اپنے بیٹے کو اتنے دنوں تک کبھی بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ سوچنے لگی پتہ نہیں اس کا بیٹا کس حال میں ہوگا؟ اسے اپنی مرضی کا کھانا ملتا ہوگا یا نہیں۔ اس کے نہانے کے لیے سلکھشنا گرم پانی کرتی بھی ہے یا نہیں، ٹھنڈے پانی سے وہ نہاتا ہے تو اسے سردی ہو جاتی ہے، وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ بیماری کا خیال آتے ہی اسے ایسا لگتا جیسے اس کے پر لگ جائیں اور وہ دیواشیش کی دیکھ بھال کرنے کے لیے اڑ کر اس کے پاس پہنچ جائے۔ ایک دن اس کی ممتا نے اپنے بیٹے دیواشیش کے پاس پہنچا ہی دیا۔ تلسی نے بیٹے کی ایک جھلک دیکھی تو آنکھیں سیراب ہو گئیں۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ڈھیروں دعائیں دیتی رہی۔ اس کے سکھی جیون کا کامنا کرتی رہی۔

سلکھشنا کا سلوک ساس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ وہ بات بے بات پر دیواشیش کے کان بھرتی رہتی تھی۔ اور وہ تلسی پر جھلاتا رہتا تھا۔ سلکھشنا اس کی کمزوری تھی وہ اسے ذرا بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماں کی ناراضگی اور خوشی کا اسے ذرا بھی خیال نہیں تھا۔ وہ اسے اَن پڑھ گنوار عورت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اسے اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ آج جو کچھ بھی ہے اس کے پیچھے ماں کی بے شمار قربانیاں ہیں کیونکہ باپ کے مرنے کے بعد ماں ہی نے محنت مزدوری کر کے اسے پڑھایا اور نوکری لگوائی تھی۔ اسے اس قابل بنایا تھا کہ سلکھشنا جیسی لڑکیاں اس پر دل و جان سے نثار ہو سکیں۔ اس کی ساری قابلیت ماں کی دین تھی، لیکن وہ نادان اس بات کو بالکل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اپنی ماں کے لیے وہ عذاب جان بن گیا تھا۔

تلسی کی زندگی اب ایک فٹ بال بن گئی تھی۔ یہ فٹ بال کبھی لکشمی کے قدموں میں پناہ ڈھونڈتا تو کبھی پاروتی کے قدموں میں اور پھر ادھر ادھر سے بھٹک کر دیواشیش اور سلکھشنا کے قدموں میں پڑا رہتا۔

وقت گزرتا گیا۔ سلکھشنا تین بچوں کی ماں بن گئی۔ دو لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔ لڑکا سب سے چھوٹا تھا۔ بڑی لڑکی کا نام کویتا تھا چھوٹی کا نام انیتا اور لڑکے کا نام اجئے تھا۔ تلسی تینوں بچوں کو گھر کی آیا کی طرح سنبھالتی۔ بچے ہنستے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگتی۔ روتے تو پریشان ہو جاتی۔ بیمار ہو جاتے تو رات رات بھر جاگ کر تیمارداری کرتی رہتی۔ اس دکھ میں بھی اسے سکھ کا احساس ہوتا تھا۔ سلکھشنا تو نمبر ایک پھوہڑ عورت تھی اس سے نہ گھر سنبھلتا تھا نہ ہی بچے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو سنبھالنا بھی اس کے لیے دوبھر تھا۔

یوں تو اکثر ہی دیواشیش اور سلکھشنا تلسی پر برستے، گرجتے دکھائی دیتے اور وہ بچوں کو

لے کر گھر سے باہر اوٹلنے پر آ کر بیٹھ جاتی۔ لیکن آج محلے والوں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا اس پر کسی کو وشواس نہیں آ رہا تھا۔ سلکھشنا نے آج پھر کسی بات پر دیواشیش کو تلسی کے خلاف بھڑکایا تھا۔ لڑائی جھگڑے سے تنگ آ کر اس نے اپنی پوٹلی اٹھائی اور لکشمی کے یہاں جانے لگی۔ اس کے چلے جانے پر گھر کا سارا کام سلکھشنا کو کرنا پڑتا تھا اور وہ باؤلی ہو جاتی پھر اس سے بچے بھی نہیں سنبھلتے تھے۔ تلسی کے رہنے پر کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے سلکھشنا اب تلسی کو کہیں جانے نہیں دیتی تھی۔

تلسی جب کپڑے کی پوٹلی اٹھا کر گھر سے باہر نکلی تو سلکھشنا نے دیواشیش کو پیچھے دوڑایا وہ اس کے بال پکڑ کر گھسیٹتا ہوا سڑک سے گھر تک لایا اور دھکا دے کر اسے گھر کے دروازے میں ڈال دیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنی ماں کے سر اور گلوں پر کئی زوردار تھپڑ مارے۔ تلسی کے ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ بری طرح ولاپ کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی'' دیواشیش! تیرا ستیہ ناش ہو، تیرے منہ میں کیڑے پڑیں، تیرے ہاتھ کوڑھی ہوں، تیری رانڈ اور تیری اولاد کبھی سکھی نہ ہو، تو تڑپ تڑپ کر مرے۔''

محلے کے سارے لوگ تلسی کا ولاپ اور دیواشیش کا زور زور سے چلانا سن کر وہاں جمع ہو گئے تھے اور سب ہی دیواشیش کے نام پر تھو تھو کر رہے تھے۔ سب کی زبان پر یہی تھا'' کیا اسی دن کے لیے اس نے محنت مزدوری کر کے اسے پڑھا لکھا کر اس قابل بنایا تھا۔''

دوسرے دن تلسی پھر وہاں دکھائی نہیں دی۔ وہ اپنی بیٹی کے یہاں چلی گئی تھی اور پھر مرتے دم تک واپس نہیں آئی تھی۔

دیواشیش کا لڑکا اجئے پولیو کا شکار ہو گیا تھا۔ کئی ڈاکٹروں سے اس کا علاج کروایا لیکن ٹھیک نہیں ہوا۔ دیواشیش کو گلے کا کینسر ہو گیا تھا۔ اب وہ بول نہیں پاتا تھا۔ اس لیے اسے نوکری سے مجبوراً استعفیٰ دینا پڑا۔ کچھ ہی سالوں میں گھر کے حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

دیواشیش کی دونوں لڑکیاں جوان ہو گئی تھیں۔ جیسے تیسے دونوں کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ بڑی لڑکی کو اس کے پتی نے شادی کے ایک سال بعد یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا کہ وہ بدچلن ہے۔ دوسری لڑکی کو اس کے پتی نے جلا کر مار ڈالا۔ دیواشیش اور سلکھشنا جوان بیٹی کی موت پر تڑپتے اور آنسو بہاتے رہ گئے۔ اندر ہی اندر وہ بری طرح ٹوٹتے بکھرتے جا رہے تھے۔ بڑی بیٹی کو یتا واپس دیواشیش کے پاس آ گئی تھی۔ ہر رات اس سے ملنے شہر کے رئیس آتے تھے جن سے وہ اوپر والے کمرے میں جا کر ملتی اور نیچے دیواشیش اور سلکھشنا پہرہ دیتے رہتے تھے۔ پولیو کا شکار اجئے بستر پر

بے بس اور مجبور پڑا رہتا۔

دیواشیش کا گلے کا کینسر بڑھتا جا رہا تھا۔ ہاتھ کی انگلیاں بھی کوڑھ کا شکار ہونے لگی تھیں۔ سلکھشنا اس سے دور دور رہنے لگی تھی۔ وہ کبھی اس کے پاس جاتا تو دھکا دے کر دور ہٹا دیتی تھی۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ اس کا شریر سڑ گیا تھا۔ وہ جب بھی آئینہ دیکھتا اسے اپنا چہرہ بہت ہی بھیانک نظر آتا۔ وہ جب اپنے ہاتھ دیکھتا تو اسے یاد آتا انھیں ہاتھوں سے اس نے اپنی ماں کو مارا تھا۔ اس ماں کو جس نے اپنی پوری زندگی اس کے لیے بلیدان کر دی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ دیوانوں کی طرح زور زور سے پتھریلے فرش پر مارتا یہاں تک کہ انگلیوں سے خون رسنے لگ جاتا۔ پھر انہیں لہولہان ہاتھوں سے وہ سلکھشنا کا گلا دبانے کے لیے دوڑتا اور وہ ڈر کر چلاتی ہوئی باہر بھاگ جاتی۔ محلے کے لوگ یہ تماشہ دیکھنے کے لیے اکٹھا ہو جاتے۔

آج اسے الماری میں اپنے بچپن کی ایک تصویر مل گئی جس میں وہ ماں کی گود میں بیٹھا ہے اور ماں ہنس رہی ہے۔ پہلے تو وہ اس تصویر کو دیکھ کر دیر تک روتا رہا پھر اسے دیوار پر سجا کر پوجا کرنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ماں اسے آشیرواد دے رہی ہے۔

☆☆

ڈاکٹر فراز حامدی

تجزیہ—ماں

اُردو افسانوی ادب میں کچھ مشہور کرداروں کے زندہ و پائندہ رہنے کی بنیاد یہ ہے کہ افسانے کا مرکزی کردار حالات و واقعات کے تصادم کے باعث وہ اپنی فطرت کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کر سکا یا شدت عمل دل و دماغ میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے یا پھر اس کی تقدیس و حرمت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ ابراہیم اشک کا افسانہ ''ماں'' میں بھی تقدیس و ہمدردی کے جذبات فوری طور پر قاری کے ذہن پر مُرتسم ہوتے ہیں مگر دیر پا نہیں۔

ماں اور بچّہ کا مقدس رشتہ قدرت کا بہترین عطیہ ہے جو تہذیب و تمدن، دھرم و مذہب، ملکی سرحدوں اور ذاتوں۔ قوموں کی تفریق سے بھی بلند ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام تہذیبوں میں عموماً اور ہندوستانی تہذیب میں خصوصاً ماں ایک ایسا وجود ہے جو انسان کے لئے سب سے زیادہ قابلِ احترام ہے اور اس کی عظمت و تقدیس مسلّم ہے۔ ابراہیم اشک کا یہ افسانہ ''ماں'' کے رشتے کو نئی جہت سے روشناس کراتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ ماں کتنی عظیم ہوتی ہے۔

افسانے کا محوری فرد ''تلسی'' ہے جس کی دو بیٹیاں لکشمی اور پاروتی نام کی تھیں۔ بیٹے کی تمنا لے کر وہ اپنی سہیلی صغریٰ کے ساتھ اجمیر خواجہ صاحب کی درگاہ پر جاتی ہے۔ منت مانگتی ہے اور اس طرح اس کے ایک بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ جس کا نام تلسی نے ''دیوآشیش'' رکھا۔ تلسی کا شوہر شرابی تھا۔ ابھی دیوآشیش پانچ سال کا تھا، پاروتی نو سال کی اور لکشمی تیرہ سال کی تھی کہ وہ پرلوک سدھار گیا۔ تلسی ہمّت والی تھی۔ اس نے اپنے تینوں بچّوں کی پرورش و پرداخت محنت مزدوری کر کے بہم پہنچائی۔ دونوں لڑکیوں کی شادیاں کیں اور اپنے بیٹے کو بھی ایم۔ اے تک تعلیم دلا کر اسکول ماسٹر بنوایا۔ کہانی کا تانا بانا ماں بیٹے کے درمیان بُنا گیا ہے حالانکہ تلسی نے اسے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا مگر وہ نالائق ثابت ہوا۔ ماں کی مرضی کے خلاف دیوآشیش، سلکھشنا نام کی ایک اسکول ٹیچر سے کورٹ میرج کر لیتا ہے اور اسے گھر لے آتا ہے۔ یہیں سے کہانی میں موڑ آتا ہے۔ سلکھشنا کے

ترتیب

☆	گفتنی	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	9
1-	دھندہ	ابراہیم اشک	11
	◄ تجزیہ	خالد حسین خاں	14
2-	جیون دان	ابراہیم اشک	19
	◄ تجزیہ	افتخار اجمل شاہین	22
3-	زندہ تصویر	ابراہیم اشک	25
	◄ تجزیہ	رضوان احمد	31
4-	بیکری	ابراہیم اشک	35
	◄ تجزیہ	عبدالواسع	39
5-	ماں	ابراہیم اشک	45
	◄ تجزیہ	فراز حامدی/نذیر فتح پوری	51
6-	سرحد	ابراہیم اشک	57
	◄ تجزیہ	یٰسین احمد	62
7-	تہذیب	ابراہیم اشک	64
	◄ تجزیہ	سید احمد قادری	72
8-	شاہ بیگم	ابراہیم اشک	76
	◄ تجزیہ	مراق مرزا/عبدالرحمٰن	94
9-	سانپ	ابراہیم اشک	105
	◄ تجزیہ	رفیق شاہین/قمرالدین فلک	109

پیار میں دیوآشیش ماں کی ممتا کو بھول جاتا ہے اور ماں کے ساتھ ایک نوکرانی جیسا سلوک کرتا ہے مگر تلسی اُف تک نہیں کرتی۔ بہو بیٹے کے کپڑے دھونا، کھانا بنانا اور برتن مانجھنا، دونوں کی ضرورتیں پوری کرنا ہی اس کا معمول بن جاتا ہے۔ تنگ آکر وہ بیٹیوں کے گھر رہنے چلی جاتی ہے مگر دو مہینے بعد بیٹے کی محبت پھر اسے کھینچ لاتی ہے اور بیٹے بہو کی سختیاں برداشت کرتی ہے۔

وقت گزرتا گیا۔ سلکھشنا بھی تین بچوں کی ماں بن جاتی ہے۔ تلسی کی طرح دوڑ کیاں کویتا، انیتا اور ایک لڑکا اجے۔ تلسی انہیں بھی آیا کی طرح سنبھالتی ہے۔ پانی جب سر سے اونچا ہوجاتا ہے تو وہ اپنی کپڑوں کی پوٹلی لے کر گھر سے جانا چاہتی ہے مگر اس کا بیٹا اپنی بیوی کے بہکاوے میں آکر ماں کو روکتا ہے۔ اسے گھسیٹ کر لاتا ہے اور ماں کو پیٹتا ہے۔ تلسی اسے بددعا دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیوآشیش کو گلے کا کینسر ہوجاتا ہے، ہاتھوں میں کوڑھ ہوجاتا ہے، چہرہ بگڑ جاتا ہے اور پچھتاوے کی آگ میں جھلستا رہتا ہے۔

ویسے تو کہا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگار نے اپنی کہانی کا پلاٹ بڑی چابکدستی سے ترتیب دیا ہے۔ لیکن تکنیکی اور فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ افسانہ کی تعریف اور کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔ افسانہ میں افسانہ نگار زندگی کے کسی ایک رُخ کو واضح کرتا ہے اور مختصر افسانہ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک پوائنٹ سے شروع ہوکر دوسرے پوائنٹ پر ختم ہوجاتا ہے، لیکن یہ افسانہ ایک ناول جیسی قصہ گوئی کا حامل ہے اور پوری داستان ایک ''مووی'' کی طرح چلتی ہے۔ تلسی اپنے بچوں کو پالتی ہے، بچے بڑے ہوجاتے ہیں، شادیاں ہوجاتی ہیں۔ ''مختصر افسانہ'' اتنی طول طویل زندگی کا متحمل نہیں ہوتا اسی لئے واقعات کی افزونی نے افسانہ کو بوجھل بنادیا ہے۔ دوسرے یہ کہ تلسی افسانے کا مرکزی کردار ہے جس کے ذریعہ افسانہ نگار ماں کی عظمت کا پیغام دینا چاہتا ہے کہ بیٹے کی نالائقی کے باوجود وہ سختیاں برداشت کرتی ہے مگر آخر میں جب بیٹا مار پیٹ کرتا ہے تو وہ اسے اس طرح بددعا دیتی ہے:

> ''دیوآشیش! تیرا ستیاناس ہو، تیرے منہ میں کیڑے پڑیں، تیرے ہاتھ کوڑھی ہوں، تیری رانڈ اور تیری اولاد کبھی سکھی نہ ہو، تو تڑپ تڑپ کر مرے''۔

تو اس کی عظمت اور ممتا کے سارے تار و پود بکھر سے جاتے ہیں۔ ماں تو ممتا کا ساگر ہوتی ہے۔ وہ کبھی بھی اپنی اولاد کو اس طرح بددعا نہیں دے سکتی۔ جس بیٹے کے لئے وہ منت مانگنے کے واسطے خواجہ غریب نواز کی چوکھٹ پر گئی ہو، جس بیٹے کو اس نے ''راجہ بابو'' کی طرح پال

پوس کر بڑا کیا ہو اور جس کی تعلیم و تربیت میں ہر طرح کا دُکھ بھوگا ہو اس کو اس طرح ''شراپ'' دینا مرکزی کردار اور وہ بھی ''ماں'' کو زیب نہیں دیتا۔

اکثر کامیاب افسانہ نگاروں کے افسانوں میں کلائمکس ہوتا ہے جو آخر میں قاری کو تجسس میں مبتلا کر کے چونکا تا ہے کیونکہ افسانہ کا خاتمہ اس کی توقع کے برخلاف ہوتا ہے۔ اس افسانہ میں کلائمکس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ قاری کو انجام کا پتہ پہلے ہی محسوس ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں پورا افسانہ بیانیہ لہجے میں بیان کیا گیا ہے کہیں بھی مکالموں کا سہارا نہیں لیا گیا ہے۔ جو کردار سازی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نغمہ نگار ابراہیم اشک کا یہ افسانہ اگر چہ ایک ماں کی دکھ بھری کہانی ہے اور ایک نالائق بیٹے کی داستان ہے مگر اس میں افسانوی عنصر ہونے کے باوجود کئی طرح کے جھول ہیں۔ افسانہ نگار نے افسانہ کی فنّی دروبست سے کام نہیں لیا ہے۔ قاری اسے پڑھنے کے بعد صرف کفِ افسوس مل سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ افسانہ ہمیں سبق دیتا ہے کہ خدا کی مصلحت میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہئے ورنہ اس کے نتائج اذیّت ناک اور خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ تلسی کو خدا نے بیٹیوں کی شکل میں اولاد دی تھی اسی پر قناعت کر لیتی تو یہ بُرے دن دیکھنے نہ پڑتے۔ کیوں اولادِ نرینہ کے لئے دوڑی گئی اور اپنی زندگی کو بالآخر جہنم بنالیا۔

ایک عام قاری بہر حال اس افسانہ سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

123, J.P. Colony, Sector- 1, Amani Shah Road,
Shastri Nagar, Jaipur- 302016(Rajasthan)

☆☆

نذیر فتح پوری

تجزیہ — ماں

ابراہیم اشک اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یکساں لکھتے رہے ہیں۔ فلموں میں گیت نگاری نے ان کی عوامی شہرت میں اضافہ کیا ہے۔ ادبی رسائل کے توسط سے انھوں نے غزل، نظم، رباعی، دوہا اور گیت جیسی اصناف میں اپنی فکر کے چاند پوری توانائی کے ساتھ روشن کئے ہیں۔ وہ تنقیدی شعور کے حامل ایک ایسے تخلیق کار ہیں جو اپنے فن پاروں کو ناپ تول کر پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ موصوف نے غالب کے اشعار کی شرح بھی کی ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک اہم کام ہے۔ جب رام جی کے دکھ نے ان کے دردل پر دستک دی تو وہ اس کے اظہار کے لیے افسانوں کی دنیا میں لوٹ آئے کیونکہ رام جی کا دکھ غزل کے دو مصرعوں میں ڈھل کر اپنے مکمل اظہار تک دسترس حاصل نہیں کرسکتا۔ رام جی کے دکھ کو اگر استعاروں کا روپ دیا جائے تو اس کی شعاعیں چاروں طرف پھیلتی دکھائی دیتی ہیں۔ ویسے رام جی کا اپنا کوئی دکھ نہیں ہے۔ رام جی نے دنیا میں جتنے انسان پیدا کئے ہیں ان سب کی زندگی دکھوں سے عبارت ہے۔ ان دکھوں کے الگ الگ چہرے ہیں۔ جدا جدا روپ ہیں۔ ان کو محسوس کرنے کا الگ الگ ذائقہ بھی ہے۔ اس دنیا میں سب سے گہرے اور رلانے والے دکھ رشتوں کے ہوتے ہیں۔ رشتوں کے ان دکھوں میں سب سے شدید دکھ ماں کا ہے۔ ذرا تصور تو کریں۔ اگر ماں نہ ہوتی تو دنیا کس طرح وجود میں آتی، ابراہیم اشک نے اس انتہائی حساس موضوع کو اپنے افسانے کا مرکزی کردار بنایا ہے۔ یہ افسانہ جس کا عنوان ہے ماں کوئی نیا عنوان نہیں ہے۔ کہانی بھی نئی نہیں ہے۔ اس عنوان سے بے شمار افسانے اب تک لکھے جا چکے ہیں۔ اتنا لکھا جانے کے باوجود یہ عنوان کبھی پرانا نہیں ہوگا۔ جب تک دنیا کی آخری ماں آخری بچے کو جنم دیگی تب تک ماں کے نام سے افسانے لکھے جاتے رہیں گے اور ہر افسانے کا عنوان بھی ماں ہی ہوگا۔

ابراہیم اشک جس طرح شعر کہنے کے ہنر سے واقف ہیں اسی طرح اب ان پر افسانہ نگاری کا ہنر بھی کھلنے لگا ہے۔ شاعری کے میدان میں ان کی برسوں کی ریاضت ہے لیکن افسانے نے ان

کی فکر کے دروازے پر نئی نئی دستک دی ہے۔

جس کہانی کا یہاں ذکر آیا ہے۔ اس پر دل کھول کر گفتگو ہو تو بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں۔ ماں کا مرکزی کردار تلسی نے ادا کیا ہے۔ ہندو دھرم میں تلسی کے پودے کو اہمیت حاصل ہے۔ عورت کو آنگن کی تلسی کہا جاتا ہے۔ تلسی صبر اور قربانی کا استعارہ بھی ہے۔ عورت ابتداء میں والدین کے لیے جان دیتی ہے، پھر شوہر پر قربان ہوتی ہے، اس کے بعد اولاد کے لیے اپنا وجود مٹا دیتی ہے۔ ابراہیم اشک کی کہانی کی تلسی بھی ایثار اور قربانی کا مجموعہ ہے جو اپنے شرابی شوہر کی موت کے بعد اپنے تین بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ ان کو پڑھاتی ہے۔ دو بیٹیوں کی شادیاں کر کے انھیں ان کے گھروں کو بھیج دیتی ہے۔ لیکن تلسی کا اکلوتا بیٹا نافرمان ثابت ہوتا ہے وہ اپنی مرضی سے دلہن بیاہ کر لے آتا ہے۔ تلسی کے خواب بکھر جاتے ہیں۔ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کے لیے جو تصور باندھ رکھا تھا وہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ تلسی کا بیٹا اجمیر کے خواجہ کی دعاؤں کے طفیل پیدا ہوتا ہے۔ وہ ماں کا نافرمان ہی نہیں بیوی کا بے درم غلام بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہانی کار اس بات سے کیا تاثر دینا چاہتا ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اسلام کے عقیدے کے مطابق کوئی بزرگ کسی کی گود بھرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اگر کسی موجود فقیر کی دعا سے کسی کو اولاد ملتی ہے تو وہ بدکار کبھی نہیں ہوتی۔ تاریخ میں بھی ایسے واقعات موجود ہیں۔ جس کی یہاں مثال دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ غریب نواز کے ذکر کے بغیر بھی افسانے کی ابتدا ہو سکتی تھی۔

تلسی ایک ماں کا فرض پوری طرح ادا کرتی ہے۔ وہ بیٹے کا ظلم ہستی ہے۔ بہو کی زیادتی برداشت کرتی ہے۔ جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ باری باری اپنی دونوں بیٹیوں کے یہاں ہو آتی ہے۔ پھر اس کی ممتا بیدار ہوتی ہے۔ اسے اپنے بیٹے کی یاد آتی ہے اور وہ اپنی بیٹیوں سے رخصت ہو کر پھر بیٹے اور بہو کے ظلم سہنے کے لیے گھر آ جاتی ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ تلسی کی طرح اس کی بہو بھی پہلے دو بیٹیوں کو جنم دیتی ہے اور پھر ایک بیٹا اس کے یہاں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن بہو ساس کی طرح بیٹے کی پیدائش کے لیے کسی مزار پر حاضری نہیں لگاتی۔ یہ بیٹا اسی طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔

بیٹے کا ظلم جب تلسی کے صبر کی ساری حدیں پار کر جاتا ہے۔ وہ بھرے محلّے میں سب کے سامنے ماں کی پٹائی کرتا ہے۔ اس کے گالوں پر تھپڑ مارتا ہے تو تلسی ماں سے ڈائن بن جاتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو دل کھول کر بددعا دیتی ہے اور وہ بددعا اتنی جلدی رام جی کے دربار میں درجۂ قبولیت کو پہنچ جاتی ہے کہ تلسی کے بیٹے کا گھر برباد ہو جاتا ہے۔

کہانی میں حقائق کے مقابلے میں جذباتیت کا غلبہ ہے۔ کہانی سوچنا اور کہانی کہنا آسان ہوسکتا ہے۔ لیکن کہانی لکھنا مشکل کام ہے۔ یہ مشکل کام ابراہیم اشک نے کر دکھایا ہے۔ کہانی کا اختتام بھی جذبات سے مملو ہے۔ بیٹے کا الماری کھولنا۔ اس میں سے ایک تصویر کا برآمد ہونا جس میں تلسی اپنے بیٹے کو گود میں لیے ہنس رہی ہے۔ بیٹا اس تصویر کو دیوار پر سجا کر اس کو پوجا کرنے لگتا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ماں اسے آشیرواد دے رہی ہو۔

شاعری واردات قلب کا اظہار ہوسکتی ہے لیکن کہانی زندگی کے حقائق کا برملا اظہار ہوتی ہے۔ شاعری میں یہ سوچنے کی ضرورت اور گنجائش نہیں کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے یا ایسا ہوتا ہوگا۔ لیکن کہانی کو بنیاد فراہم کرنے کے لیے یہ سوچنا ضروری ہے کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے۔ جو ہوسکتا ہے اسے بیان کرنے کا نام ہی کہانی ہے۔ مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ عمارت سازی کے کام میں مزدوری کرنے والی عورت تین بچوں کی پرورش کر کے دو منزلہ پختہ مکان کبھی نہیں بنا سکتی۔ کیونکہ دیواروں پر پلاسٹر کرنے اور چونا پوتنے کا کام میں نے بہت کیا ہے۔ ابراہیم اشک کو اس کا مشاہدہ نہیں ہے۔ کہانی میں مشاہدہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کچھ کہانیاں محض تصوراتی ہوتی ہیں تو ان کی ساری کمیاں اور خامیاں یہ کہہ کر چھوڑ دی جاتی ہیں کہ یہ محض کہانی کار کا تصور ہے۔ لیکن جب ہم سماج اور معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں کی بات کرتے ہیں تو حقائق کا ادراک ضروری ہوتا ہے۔ سینیر لکھاریوں کو مشورہ نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جن کرداروں پر لکھا جائے ان کا مشاہدہ کیا جائے۔ عام قاری کے لیے یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ کئی فلموں میں دیکھا گیا کہ جس بچے کی ماں کسی عمارت میں عمارت سازی کے وقت، مزدوری کرتی دکھائی جاتی ہے ایک دن وہی بچہ اس عمارت کا مالک بن جاتا ہے۔ لیکن سچائی تو یہ ہے کہ مزدوروں کے اپنے جھونپڑے بھی نہیں ہوتے۔ یہ الگ بات کہ تقدیر کسی پر مہربان ہو جائے تو اس سے بعید بھی نہیں۔

بہرحال ابراہیم اشک کے ذہن میں ماں کا ایک ایثار اور قربانی سے بھرا وجود موجود ہے۔ اسی کو انہوں نے کہانی کا روپ دینے کی کوشش کی ہے۔ ماں کا یہی روپ غالب روپ ہے۔ اسی روپ میں ماں کی ممتا پوشیدہ ہے۔ ماں کے اس روپ کی حفاظت خود خدا کرنے والا ہے کیونکہ اسلامی عقیدے کے مطابق خدا خود اپنے دل میں بندوں کے لیے ستر ماؤں کا پیار رکھتا ہے۔

Saira Manzil, 230-B\102
Viman Darshan,Sanjay Park
Lohgaon Road, Pune-411032

☆☆

سرحد

مرنے کے بعد سینک وحید احمد کو ملک کے صدر کی طرف سے ''ویرتا پرسکار'' دیا جا رہا تھا جسے لینے وحید احمد کی بیوی نجمہ اور اس کا پانچ سال کا بیٹا شہاب آئے ہوئے تھے۔ نجمہ کی عمر پچیس سال کی تھی لیکن دیکھنے میں وہ بیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ ''ویرتا پرسکار'' لینے جب نجمہ اپنے بیٹے کے ساتھ پہنچی تو صدر محترم نے ننھے شہاب سے بھی ہاتھ ملایا اور اس کے گال پر ہاتھ لگا کر بڑے پیار سے سہلایا۔ شہاب کو یہ لمس بہت اچھا لگا۔

نجمہ کے ماں باپ اور بھائیوں نے بہت زور دیا کہ وہ دوسری شادی کر لے کیونکہ اکیلے جوان عورت کا زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ برادری کے کئی شریف اور پڑھے لکھے لڑکوں کے رشتے بھی بتائے گئے لیکن نجمہ نے کسی کی نہیں سنی۔ اسے ڈر تھا کہ دوسری شادی کے بعد شہاب کی دیکھ بھال وہ اچھی طرح نہیں کر پائے گی اور نہ ہی ماں کا وہ پیار دے پائے گی جس کی اسے ضرورت ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وحید کی یادوں کے سہارے اور شہاب کو اپنی زندگی کا مقصد بنا کر وہ دنیا کے ہر کٹھن راستے سے گزر جائے گی۔

شہاب بڑا ہی خوبصورت اور پیارا بچہ تھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ رونا تو جیسے اسے آتا ہی نہیں تھا۔ ماں اس کی ہر ایک مسکراہٹ پر واری جاتی۔ اسے اچھے سے اچھا کھلاتی اور پہناتی۔ شہاب اس کے لیے کسی راجا بابو سے کم نہیں تھا۔ وہ ذرا سا اداس ہوتا تو باؤلی ہو جاتی۔ بار بار نمک مرچ لے کر اس کی نظر اتارتی۔ ذرا سا بخار بھی آ جاتا تو رات رات بھر جاگتی رہتی۔ بڑے ارمانوں اور لاڈ پیار سے وہ، شہاب کو پال پوس کر بڑا کر رہی تھی۔

وقت کا دھارا یونہی بہتا رہا نجمہ کے بال چاندی ہونے لگے اور بیٹا شہاب سونے کی طرح نکھرتا چلا گیا۔ جس سے ملتا اس کا دل جیت لیتا تھا۔ ہر کوئی شہاب کو چاہتا تھا۔ سب یہی کہتے: ''اولاد تو نجمہ نے سدھاری ہے۔ شہاب کو دیکھو، ہر طرف اس کے دوست ہی دوست ہیں دشمن

کوئی بھی نہیں ہے۔'' نجمہ اپنے بیٹے کی تعریف سن سن کر نہال ہو جاتی اور خدا سے دعا کرتی کہ اسے ہر میدان میں کامیابی عطا کرے۔

کالج کی ہر لڑکی شہاب کے خواب دیکھتی تھی۔ وہ سب سے ہنس کر ملتا، باتیں کرتا، لطیفے سناتا، خوب ہنستا ہنساتا لیکن کسی کو اتنا قریب بھی نہیں آنے دیتا کہ وہ پیار محبت کی غلط فہمی کا شکار ہو جائے۔ لڑکیاں طرح طرح کے بہانے تلاش کرتیں، اس سے ملتیں اور اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کرتیں لیکن شہاب اس خوبصورتی سے نکل جاتا کہ لڑکیاں دیکھتی رہ جاتی تھیں۔ نجمہ سب جانتی تھی۔ وہ اس کے لیے ایسی بہو لانا چاہتی تھی جو ان تمام گوپیوں سے زیادہ سندر اور گنوں والی ہو۔ برادری میں شادیاں ہوتیں تو نجمہ کی نظر لڑکیوں ہی کو پرکھنے میں لگی رہتی کہ کون اس کے شہاب کی دلہن بننے لائق ہے۔ ایک ایک کر کے وہ ہر لڑکی کو رد کر دیتی۔ کوئی اسے شہاب کے لائق نظر ہی نہیں آتی۔

ایک دن گھر میں شہاب چپ چاپ سا تھا۔ نہ ہنسی نہ مذاق نہ کوئی بات۔ نجمہ کو اس کی خاموشی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے پوچھا:

''کیا بات ہے۔ کیا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟''

''نہیں تو۔'' شہاب نے دھیرے سے کہا۔

''کچھ تو ہوا ہے بیٹا۔'' نجمہ نے چھیڑا۔

''کیا ہوا ہے؟'' الٹا شہاب نے سوال داغ دیا۔

''یہ تو تیرا دل ہی جانتا ہوگا بیٹا میں کیا جانوں۔ لیکن بات کوئی خاص ہے ضرور، بتا دے۔ بتا دے۔ کیا اپنی ماں سے چھپائے گا؟'' نجمہ نے ہنس کر کہا۔

ماں کو ہنستے اور چھیڑتے ہوئے دیکھ کر شہاب بھی ہنس پڑا۔ ہنستے ہنستے بولا:

''کیا ماں آپ بھی بلاوجہ پریشان کرتی ہیں۔''

اب نجمہ کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا۔ وہ بولی ''پریشان میں نہیں کر رہی ہوں بیٹا۔ یہ تو کوئی اور ہی ہے۔ کون ہے؟ چل میرے کان میں کہہ دے۔''

نجمہ نے اپنا کان آگے بڑھا دیا اور شہاب نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر دھیرے سے شرماتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب کی لڑکی۔ کویتا۔'' اتنا کہہ کر وہ گھر سے باہر بھاگ گیا۔ نجمہ پہلے تو چونک کر ہنسی پھر سوچ میں پڑ گئی۔

کویتا اور شہاب بچپن کے ساتھی تھے۔ ساتھ کھیلے، پڑھے اور بڑے ہوئے تھے۔ نجمہ

جب بھی کویتا کو شہاب کے ساتھ دیکھتی تو سوچتی۔ میں شہاب کے لیے ایسی ہی لڑکی لاؤں گی۔ پھر وہ اللہ سے شکایت کرتی۔ کیا کویتا کو ہماری برادری میں نہیں پیدا کیا جا سکتا تھا؟ کتنی آسانی ہوتی اگر ایسا ہوتا تو۔ پلک جھپکتے میں وہ شہاب کے رشتے کے لیے اس کے ماں باپ کے پاس پہنچ جاتی اور اسے دلہن بنا کر اپنے گھر لے آتی۔ لیکن جہاں دو دلوں کے درمیان مذہب کی اونچی دیوار کھڑی ہو وہاں انسانی رشتے کتنے مشکل ہو جاتے ہیں؟ کتنا ڈر ہوتا ہے؟ کتنی وحشت ہوتی ہے؟ انسان انسان نہیں رہتا ہے۔ جنگلی جانور بن جاتا ہے۔ یہ دیواریں۔ یہ سرحدیں آخر کب ختم ہوں گی؟

وہ سوچنے لگی خدا نے عشق کیوں بنایا ہے؟ یہ نہ مذہب دیکھتا ہے نہ ذات، نہ غریب دیکھتا ہے نہ امیر، زندگی دیکھتا ہے نہ موت۔ بس اسی ایک چہرے کو دیکھتا ہے جو اسے پسند آجاتا ہے۔ اس چہرے پر سے پھر نظر نہیں ہٹاتا ہے۔ وہ تو چکور بن جاتا ہے۔ اپنے چاند کے لیے اپنے محبوب کے لیے۔

شہاب اور کویتا کی جوڑی تو لاکھوں میں ایک ہے، خدا نے جیسے دونوں کو ایک دوسرے ہی کے لیے بنایا ہے۔ لیکن اس رشتے پر کیا وکیل صاحب راضی ہو جائیں گے؟..... نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ شہاب کو سمجھائے گی..... کیا شہاب مان جائے گا؟..... شاید مان جائے..... شاید نہیں مانے..... جوان ہے..... گرم خون ہے..... تو کیا خون خرابہ ہوگا..... فساد ہوگا..... شہر جلے گا..... نہیں..... نہیں..... وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گی۔ شہاب کو اپنے دودھ کو واسطہ دے کر منالے گی۔ پھر وہ اپنے دل کو تسلی دیتی۔ آج کل تو سب ہونے لگا ہے۔ ساری دیواریں..... ساری سرحدیں ختم ہوتی جارہی ہیں۔ دنیا سمٹ رہی ہے۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

وکیل صاحب شہاب کے والد کے لنگوٹیا یار تھے۔ نجمہ کو بھابھی کہتے تھے۔ کویتا اسے چاچی کہتی تھی۔ ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا تھا۔ خاندانی رشتے تھے، شہاب کو وکیل صاحب اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے۔ شہاب انہیں وکیل چاچا کہا کرتا تھا۔ وہ ان کے گھر میں بے روک ٹوک آتا جاتا ہے۔

رات میں سوتے وقت نجمہ نے شہاب کو کریدنا چاہا۔ ''سچ بتانا..... کیا کویتا بھی تجھے پیار کرتی ہے؟''

''ہاں۔ تب ہی تو میں نے آپ کو بتایا ورنہ یہ بات میں آپ کو کیوں بتاتا؟'' وہ بولا۔

''کیسے معلوم ہوا تجھے کہ وہ تجھ سے پیار کرتی ہے؟'' نجمہ نے خلاصہ کرنا چاہا۔

''اسی نے مجھے بتایا۔ پہلے تو میں نے مذاق سمجھا لیکن وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہے۔ وہ کہتی ہے۔ میں تمہارے علاوہ کسی دوسرے سے شادی نہیں کروں گی۔'' شہاب نے خلاصہ کیا۔

''اور تُو۔ کیا تُو بھی اسے چاہتا ہے؟'' نجمہ نے بیٹے کے دل میں جھانکنے کی کوشش کی۔

''میں تو اسے بہت دنوں سے چاہتا تھا لیکن اظہار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ڈر لگتا تھا۔'' شہاب نے کہا۔

''اور اب ڈر نہیں لگتا۔'' نجمہ نے پوچھا۔

''اب تو ڈر کی کوئی بات نہیں رہی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دل کی بات جان گئے ہیں۔'' شہاب سادگی سے بولا۔

''اور جب یہ بات ساری دنیا جان لے گی تب کیا ہوگا؟ یہ بھی سوچا ہے تو نے کبھی؟'' نجمہ نے سوال کیا۔

''وہ وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔ ابھی سے اس کے لیے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر آج کل تو ہمارے ملک میں ایسی کئی شادیاں ہو رہی ہیں۔ ایک اور ہو جائے گی تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا؟ آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔'' شہاب نے نجمہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ لیکن نجمہ کی پریشانی ختم نہیں ہوئی۔

گریجویشن کرنے کے بعد شہاب فوج میں داخل ہو گیا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح ملک کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اکلوتا بیٹا ہونے کے باوجود نجمہ نے اسے فوج میں داخل ہونے سے نہیں روکا۔ پہلے اس نے اپنے شوہر کو ملک پر قربان کیا تھا اور اب اس کا بیٹا بھی اسی راستے پر چل پڑا تھا۔ نجمہ کا یقین تھا۔ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ ہے۔ جہاں انسان کی موت لکھی ہے وہیں مرنا ہے۔ عام موت مرنے سے ملک کے لیے شہید ہونے کا مقام بہت بلند ہے کیونکہ سارا ملک اس کی شہادت کو سلام کرتا ہے۔

کارگل کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ شہاب مورچے پر تھا۔ نجمہ بیٹے کی کامیابی کے لیے روز دعائیں مانگتی تھی۔ کویتا اکثر نجمہ کے پاس چلی آتی اور گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی رہتی تھی۔ شہاب کے خطوط آتے تو کویتا ہی نجمہ کو پڑھ کر سناتی۔ نجمہ کو ایسا لگتا جیسے اس کا بیٹا سرحد پر ملک کی حفاظت کرنے گیا ہے لیکن اس کی بہو اس کے ساتھ ہے جو ہر طرح سے اس کی دلجوئی میں لگی ہوئی ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے شہاب کے خطوط آنا بند ہو گئے تھے۔ نجمہ کافی پریشان رہنے لگی تھی۔

ایک دن ایک خط آیا۔ نجمہ اسے پڑھوانے کویتا کے پاس جا پہنچی۔ کویتا نے پہلے خود خط کو پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہاب کی ٹکڑی کے کئی لوگ مارے گئے اور شہاب کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ کویتا کا دل ''دھک'' سے رہ گیا۔ وہ شہاب کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ کویتا نے نجمہ کو خط کا اصل مضمون نہیں بتایا۔ اسے تسلی دینے کے لیے اپنی مرضی سے ایک نیا مضمون بنا کر سنا دیا جس کے مطابق جنگ جلدی ختم ہونے والی ہے اور شہاب جلد ہی گھر واپس لوٹنے والا ہے۔ آپ چنتا نہ کریں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔

نجمہ شہاب کے لیے کافی فکر مند رہنے لگی تھی۔ کویتا اسے تسلی دینے کے لیے شہاب کے نام سے جھوٹے خط نجمہ کو لکھنے لگی تھی۔ ڈاکیہ جب خط دے کر جاتا تو کویتا مزے لے لے کر نجمہ کو پڑھ کر سناتی اور اسے خوش رکھتی۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ جنگ ختم ہوگئی۔ ایک دن شہاب گھر لوٹ آیا۔ تب ہی ڈاکیہ ایک چٹھی دے کر گیا۔ شہاب چٹھی کھول کر پڑھنے لگا۔ یہ چٹھی کویتا کی لکھی ہوئی تھی جو شہاب کی طرف سے نجمہ کے نام پر تھی۔ ابھی شہاب نے دو چار سطریں ہی پڑھی تھیں کہ کویتا سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو مسکرا دیئے۔ یہ مسکراہٹ زندگی سے موت کی سرحدوں تک پھیلتی چلی گئی۔

☆☆

-10	ملاپ	ابراہیم اشک	116
	◄ تجزیہ	نوشاد عالم آزاد	124
-11	بخشش	ابراہیم اشک	128
	◄ تجزیہ	ڈاکٹر محمد بشیر الدین	133
-12	خدا کی قسم	ابراہیم اشک	139
	◄ تجزیہ	علیم طاہر	144
-13	رام جی کا دکھ	ابراہیم اشک	151
	◄ تجزیہ	مقبول واجد	155

☆☆

یٰسین احمد

تجزیہ — سرحد

نگاہِ عشق میں رنگ، نسل اور مذہب کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہر قسم کی پابندیاں اور سرحدیں عشق کے تیز بہاؤ میں ریت کے ڈھیر کی مانند ڈھے جاتی ہیں اور جب معاملہ دو مختلف مذہب کے ماننے والوں کے درمیان ہو تو صورت حال انتہائی نازک ہو جاتی ہے۔ اس نازک اور حساس موضوع پر کسی افسانے کی بنت کا عمل ایک لکھاری کے لئے پل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے۔

ابراہیم اشک نے سرحد اسی حساس موضوع پر لکھی ہے۔

جنگ میں (یہ جنگ کونسی تھی کب اور کہاں ہوئی تھی اس کی وضاحت اشک نے نہیں کی۔ بس سمجھ لیں یہ جنگ ہمارے کسی پڑوسی ملک سے ہوئی تھی) شہید ہونے کے بعد وحید احمد اپنے پیچھے ایک بیوہ نجمہ اور اکلوتا بیٹا شہاب کو چھوڑ جاتا ہے۔ اس وقت نجمہ کی عمر پچیس سال اور شہاب کی عمر پانچ سال تھی۔ عین نوجوانی میں بیوہ ہونے کے باوجود نجمہ دوسری شادی نہیں کرتی اور اپنی ساری توجہ اور ممتا شہاب کی پرورش میں لگا دیتی ہے۔ شہاب خوبصورت، سمجھ دار اور ذہین ہے۔ تعلیم کے دوران شہاب کو اپنے پڑوسی وکیل کی بیٹی کویتا سے عشق ہو جاتا ہے۔ نجمہ کو جب یہ بات معلوم ہوتی ہے تو وہ بہت پریشان ہو جاتی ہے کیونکہ کویتا اور شہاب کے درمیان مذہب کی دیوار حائل تھی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد شہاب اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتا ہے اور فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ جب کارگل کی جنگ شروع ہوئی تب شہاب مورچہ پر ہوتا ہے۔ نجمہ دن رات اس کی کامیابی کی دعائیں کرتی رہتی ہے۔ ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد شہاب کا خط آتا ہے جو کویتا پڑھتی ہے۔ جس میں لکھا ہوتا ہے کہ دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہاب کی ٹکڑی کے کئی جوان مارے گئے اور شہاب کا بھی کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ کویتا اس خط کا اصل مضمون نجمہ سے چھپاتی ہے اور اس کی تسلی کے لئے ایک دوسرا مضمون بنا کر سنا دیتی ہے۔ پھر اس کے بعد وہ مسلسل شہاب کی طرف سے تسلی بھرے خط نجمہ کو لکھتی رہتی اور نجمہ کو پڑھ کر سناتی رہتی ہے۔ کئی دن گزر جاتے ہیں،

جنگ ختم ہوتے ہی ایک دن اچانک شہاب گھر لوٹ آتا ہے۔ عین اسی وقت ڈاکیہ ایک چٹھی دے جاتا ہے جو شہاب کھول کر پڑھتا ہے۔ حسب معمول چٹھی شہاب کی طرف سے کویتا کی لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ چٹھی پڑھنے کے دوران کویتا وہاں آجاتی ہے۔ کچھ سطور پڑھا ہی تھا کہ شہاب کویتا کو دیکھ کر رُک جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں اور یہ مسکراہٹ زندگی سے موت کی سرحدوں تک پھیل جاتی ہے۔

افسانہ نگار نے سرحد کا اختتام جس موڑ پر کیا ہے وہیں قاری مبہوت کھڑا رہ جاتا ہے۔ بے ساختہ کچھ سوال سطح ذہن پر ضرب لگاتے ہیں اور ایک کمی، ایک ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے۔ شاید یہی کہانی کا حسن ہے اور اشک کا منشا بھی۔ ویسے کہانی میں تسلسل، روانی اور انہماک کا عنصر غالب ہے جس سے قاری کے ذہن پر ایک دیرپا اثر مرتسم ہوتا ہے۔ پلاٹ، کردار، جذبات اور مکالمہ جو کسی افسانے کے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں سرحد میں ملتے ہیں۔ اسی سے کہانی پن کا احساس ہوتا ہے حالانکہ یہ چیزیں جدید افسانے میں مفقود ہوگئی ہیں۔

کہانی کا موضوع اچھوتا نہیں ہے، لیکن حساس ضرور ہے۔ اشک ممبئی میں رہتے ہیں، ممبئی ایک بڑا شہر ہے اور بڑے شہروں میں ایسے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کلکتہ کے مجیب الرحمٰن کا واقعہ ابھی ہم فراموش کر نہیں پائے ہیں جس نے پرینکا سے محبت کی اور اپنی جان گنوادی۔ بہت پہلے ساجد رشید نے بھی ایک کہانی راکھ اسی قسم کے موضوع پر لکھی تھی۔ میں راکھ کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ ساجد رشید اور ابراہیم اشک دونوں کا تعلق ممبئی سے ہے اور وہاں ایسے واقعات کا رونما ہونا کوئی اہمیت کی بات نہیں ہے اور نہ حیرت کی۔ فلمی دنیا میں تو ہندو اور مسلمان کے درمیان شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ممکن ہے کسی ایسے ہی واقعہ سے متاثر ہو کر اشک نے سرحد لکھی ہو؟ ابراہیم اشک نے ایک نازک موضوع کو نہایت مہارت سے برتا ہے اور فنی و تکنیکی محاسن کو مجروح ہونے نہیں دیا۔

17-2-1159/2, Wahed Colony
India Function Hall Lane
Yakut Pura, Hyd. 500023

☆☆

تہذیب

کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی مغربی موسیقی کا شور سن کر نغمہ اپنے کوٹھے کی گیلری میں نکل آئی۔ نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا تو عجیب منظر تھا۔ ایک بارات سڑک سے گذر رہی تھی اور کچھ نوجوان مائکل جیکسن کے بریک ڈانس کی بھونڈی نقل اتارنے میں اس قدر بدمست تھے کہ انھیں اپنے کپڑوں تک کی سُدھ نہیں تھی۔ نغمہ اپنی تہذیب سے کٹے ہوئے اور جڑوں سے اکھڑے ہوئے لوگوں کا یہ تماشہ دیکھ کر ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ ایسی ہی باراتوں میں ''یہ دیش ہے ویر جوانوں کا۔ البیلوں کا مستانوں کا'' جیسے نغموں کی دھنوں پر اس طرح تھرکتے اور جھومتے تھے کہ دیکھنے والی نوجوان لڑکیاں دل تھام کر رہ جاتی تھیں۔ ان میں سے کوئی کسی کی بانکی ادا پر مٹی بھی تھی۔ لیکن آج سب کچھ بدل چکا ہے۔ ہندوستانی تہذیب پر مغربی تہذیب کا زبردست حملہ ہو رہا ہے۔ مغربی رقص اور موسیقی اس حملے کے خاص ہتھیار ہیں۔ ان کا اثر ایسا ہو رہا ہے کہ ہمارے ملک کی صدیوں کی کلاسیکل روایتیں دَم توڑ رہی ہیں اور پورا سماج مغربی رنگ میں رنگتا چلا جا رہا ہے۔ تہذیب اور فن کی اس تباہی اور بربادی میں نغمہ جیسی مجرے کی باکمال فنکارہ کی حالت بھی دن بدن بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

وہ سوچنے لگی فن اور تہذیب کی تباہی سے ہی ملکوں کی تباہی کی ابتداء ہوتی ہے۔ تو کیا ہمارا ملک تباہی کی طرف جا رہا ہے؟ یہ سوال نغمہ کو بار بار پریشان کرتا رہتا۔ اپنی کوششوں سے نغمہ نے مجرے کے فن کو اس قدر بلندی پر پہنچایا تھا کہ تمام ملک میں اس کے جیسی کوئی دوسری مجرے والی نہیں تھی۔ لکھنوی، بنارسی، لاہوری، بنگالی اور دتی گھرانے کے مجرے کے فن سے وہ بخوبی واقف تھی۔ اندور کے بمبئی بازار کے اسی کوٹھے پر نغمہ کے مجروں کی کچھ برسوں پہلے تک دھوم رہا کرتی تھی۔ بڑے بڑے رئیس اس کا مجرا سننے اور دیکھنے آتے تھے اور مال و دولت سے اسے نوازتے تھے۔ اس وقت اس کی محفلیں مغل دربار کی محفلوں سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ اس کا کوٹھا دیوانِ خاص

بن جاتا۔ رقص اور موسیقی کا ایسا سماں بندھتا کہ دیکھنے والے بس دیکھتے اور سنتے ہی رہ جاتے۔ اب اسی کوٹھے پر سناٹا ہے، ویرانی ہے۔ وہ تمام شان وشوکت ختم ہوکر رہ گئی ہے۔ کوئی کوٹھے کی طرف جھانکتا ہی نہیں۔

سازندے پہلے ہر روز آتے تھے۔ اب کبھی کبھار یونہی جھانکنے چلے آتے ہیں۔ کوٹھے کی رونق ختم ہوئی تو پیٹ پالنے کے لیے کوئی ریڈیو پروگرام اور ٹی وی پروگرام میں مصروف ہوگیا تو کوئی غزل سنگروں کی محفلوں میں سنگت کرنے نکل کھڑا ہوا۔ گھر میں نغمہ کی بوڑھی ماں عظمت بیگم ہے جس نے اپنے زمانے میں راجاؤں اور نوابوں کے درباروں کی محفلوں کو اپنے شاندار مجروں سے گرمایا تھا۔ نغمہ ان محفلوں کے قصے اپنی ماں سے سنا کرتی ہے۔ بیٹی رخسار کو اس نے انگریزی تعلیم کے لیے بورڈنگ میں ڈال رکھا ہے۔ وہ جب بھی چھٹی کے دنوں میں گھر آتی ہے انگریزی موسیقی اور رقص کے پروگرام گھر میں لگے کیبل ٹی وی پر دیکھتی رہتی ہے۔ جو نہ تو نغمہ کو بھاتے ہیں نہ ہی نغمہ کی ماں عظمت بیگم کو بھاتے ہیں۔ کبھی کبھی نانی رخسار کی پسند پر تنقید کرنے لگتی ہے تو نغمہ اپنی ماں کو سمجھاتی ہے:

''کیا کریں امی۔ زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ رخسار اسی زمانے کی پیداوار ہے۔ یہ وقت کے ساتھ چل رہی ہے تو اس میں برا کیا ہے؟'' نغمہ کہتی۔

عظمت بیگم تیز آواز میں جواب دیتی ''موا یہ بھی کوئی ناچ گانا ہے۔ ہاتھ کدھر جارہا ہے اور پاؤں کدھر۔ نہ کوئی دلکش ادا ہے نہ پیارا سا انداز۔ بات تو تب ہے کہ دیکھنے والا رقص کے ہاؤ بھاؤ میں ڈوب ڈوب کر رہ جائے۔''

رخسار پر اپنی نانی کی ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا وہ مغربی رقص اور موسیقی میں ڈوبی رہتی۔ ایک ہی چھت کے نیچے تین نسلوں کا ٹکراؤ کبھی کبھی بدمزگی بھی پیدا کردیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر نغمہ ہی کبھی ماں کو تو کبھی بیٹی کو سمجھانے کا فرض ادا کرتی۔ نغمہ کی زندگی کا اب تو بس ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ کسی طرح اس کی بیٹی رخسار پڑھ لکھ کر سماج میں عزت آبرو کی زندگی گزارے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے میں ایک ایک کرکے اس کے تمام زیور بکتے جارہے تھے۔ یہ زیور اس کے سنہری دور کی یادگاریں تھیں جو اب تک وہ سنبھال کر رکھتی چلی آرہی تھی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا۔ یہ اندھیرا ابھی اس کے لیے زندگی کی بہاریں لے کر آتا تھا لیکن اب اس کے لیے مایوسی کا سبب بن گیا تھا۔ کوٹھے کا کونہ کونہ اب اسے شام ہوتے ہی کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ ایسے میں اکثر وہ جی بہلانے کے لیے ریموٹ کنٹرول لے کر گھر میں لگے

رنگین ٹی وی پر کوئی اچھا سا پروگرام دیکھنے کے چینل بدلنے لگتی۔ آج بھی وہ چینل بدلتی رہی لیکن ہر چینل پر اسے انگریزی تہذیب وتمدن میں رنگے ہوئے پروگرام ہی دکھائی دیئے۔ اکتا کر اس نے ٹی وی بند کر دیا اور رموٹ کنٹرول کو ایک طرف پھینک دیا اور اپنے پسندیدہ شاعر نثار کی ایک غزل گنگنانے لگی ''اب جینے میں وہ بات نہیں۔ وہ شام نہیں وہ رات نہیں۔'' گاتے گاتے اس کی آنکھیں بھر آئیں جسے اس نے اپنے گلابی دوپٹے سے پونچھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ تب ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے کئی لوگ بھاگتے دوڑتے اس کے کوٹھے پر گھس آئے ہیں اور ایک بھونچال سا آ گیا ہے۔ پلٹ کر نغمہ نے دروازے کی طرف دیکھا تو واقعی بھونچال آنے جیسا ہی منظر تھا۔

پانچ چھ نوجوان لڑکے جو صورت شکل اور لباس سے رئیس باپ کی بگڑی اولاد نظر آ رہے تھے شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے نغمہ کے کوٹھے پر آ گئے تھے۔ نغمہ پہلے تو انہیں دیکھ کر سہم گئی پھر ہمت کر کے ان سے یوں چلے آنے کا سبب پوچھا۔ ان میں سے ایک نے بڑے بھونڈے انداز میں کہا:

''نغمہ رنڈی کا کوٹھا یہی ہے نا؟''

''جی ہاں۔ فرمایئے۔.....'' نغمہ نے زہر کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

''اسے بلاؤ۔ ہم مجرا سننے آئے ہیں۔'' ایک نے کہا۔

''میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔'' وہ مورچہ سنبھالتے ہوئے بولی۔

''اچھا تو آپ ہی ہیں نغمہ۔'' وہ سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔

''جی ہاں.....''

''تو پھر شروع ہو جایئے دیر کس بات کی ہے۔'' اس نے نوٹوں کی گڈی سے کچھ نوٹ نکال کر ہوا میں لہرا دیئے اور مسکرا کر کہنے لگا۔ ''بہت نوٹ لائے ہیں ہم لوگ۔ بس اپنے سازندوں کو بلاؤ اور شروع ہو جاؤ۔''

نغمہ کو اس کا رویہ اچھا نہیں لگا۔ وہ تیز ہو کر بولی۔ ''مجرے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں صاحب زادے۔''

''جہاں نوٹ ہی نوٹ ہوں وہاں آداب واداب کیسا۔ چلئے ہم آج فرش پر نوٹ بچھائیں گے اور تم ان نوٹوں پر ناچو گی۔''

سب ایک ساتھ بول پڑے ''نوٹوں کے فرش پر مجرا۔ واہ کیا بات ہے۔ یہ کسی فلم سین سے کم نہیں ہوگا۔'' انہوں نے زوردار قہقہہ بلند کیا۔

نغمہ کی غیرت اسے للکارنے لگی۔ وہ بولی" دیکھئے جناب نہ تو میں کسی فلم کی ہیروئن ہوں نہ ہی میرا کوٹھا کسی فلم کا سیٹ ہے اور نہ ہی آپ جیسے بدتمیز رئیس زادوں کے لیے میرا فن ہے۔ آپ برائے مہربانی یہاں سے تشریف لے جاسکتے ہیں۔" وہ غصے میں بولی۔ سب نغمہ کے تیور دیکھنے لگے۔ ایک نے جھلا کر کہا:

"بازار کی رنڈی ہمیں نخرے دکھاتی ہے۔ ابے سالی مجرا تو کیا تیرے باپ کو بھی کرنا پڑے گا کیونکہ ہم آج مجرا دیکھنے نکلے ہیں۔"

نغمہ کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اس کے ضبط کی انتہا ہوگئی تھی۔ اس نے دروازے کے پیچھے رکھا ڈنڈا اٹھایا اور بجلی کی سی تیزی سے سب پر ٹوٹ پڑی۔ کسی کے سر میں لگی تو کسی کے ہاتھ میں، کسی کے چوٹ لال ہوگئے۔ وہ سب بلبلاتے ہوئے وہاں سے بھاگے۔ نغمہ گھائل شیرنی کی طرح دہاڑ رہی تھی۔ "یہ کوٹھا ہے حرام زادو، جہاں پر شہنشاہوں، نوابوں اور ان کی اولادوں نے محفلوں میں بیٹھنے کے آداب سیکھے ہیں۔ زبان و ادب سیکھا ہے۔ زندگی کا سلیقہ سیکھا ہے۔ یہ کوئی سستا ہوٹل، کلب یا عیاشی کا اڈا نہیں جہاں تم جیسے نو دولتیئے بھونڈی انگریزی ڈانس کرنے والی لڑکیوں کو دولت کے بل پر اپنے اشاروں پر نچا سکیں۔ یہ غیرت مند نغمہ کا کوٹھا ہے جس کے کردار سے رقص اور موسیقی اپنے معیار اپنی معراج کو پہنچ جاتے ہیں۔"

تمام لڑکے کوٹھے سے نیچے اتر کر بھاگ گئے تھے۔ نغمہ کی آواز کا شور سن کر اندر سے اس کی ماں عظمت بیگم بھی آگئی تھی۔ شاعر نثار بھی نہ جانے کب وہاں آکر کھڑا ہوگیا تھا جس کی طرف نغمہ کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ وہ اب بھی مارے غصے کے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم لوگ اپنے وجود کو بھول گئے ہو۔ اب تمہاری حالت اس پیڑ کی طرح ہے جو وقت کی تیز ہوا کے ساتھ بہنے کی کوشش میں زمین سے جڑوں کے ساتھ اکھڑا جاتا اور سوکھ جاتا ہے۔"

شاعر نثار نے اسے بانہوں میں بھر کر سہارا دیا۔ اس نے نغمہ سے کہا۔ "ان نادان لوگوں کو تم کیا سمجھا رہی ہو نغمہ۔ سمجھایا تو اسے جاتا ہے جس کے پاس عقل ہو، دماغ ہو، اچھے برے کے فرق کو سوچنے سمجھنے کی قوت ہو۔ یہ تو اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے لوگ ہیں جنہیں اپنی منزل اور اپنے راستے کا ذرا بھی علم نہیں ہے۔"

نغمہ نے جھلا کر کہا۔ "خدا جانے کیا ہوگا اس ہندوستان کا۔"

نثار نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "ہونا کیا ہے۔ ہماری زبانیں مٹ رہی ہیں۔

تہذیب وتمدن مٹ رہے ہیں۔ ہم خود ٹی وی چینلوں کے ذریعہ اپنی وراثت کو، اپنے فن کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جو حال تمہارے مجرے کا ہوا ہے وہی حال اردو زبان کا بھی ہے۔ فنکاروں کی ناقدری جس ملک میں ہونے لگتی ہے وہ ملک تباہی اور بربادی سے نہیں بچ سکتا۔''

نغمہ صوفے پر دھنس کر بیٹھتے ہوئے بولی'' یہی تو رونا ہے نثار صاحب۔ خیر جب تک جان میں جان ہے اپنے فن کو تو ہم سینے سے لگائے رکھیں گے لیکن ہمارے ساتھ ہی یہ فن قبر میں دفن ہو جائے گا۔ آنے والی نسلیں مجرے کے بارے میں کتابوں ہی میں پڑھا کریں گی کہ یہ بھی ایک ہندوستانی فن تھا۔''

''خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں یہاں بڑے اچھے موڈ میں آیا تھا لیکن یہاں آ کر تو سب چوپٹ ہو گیا۔'' نثار نے کہا۔

'' آپ جیسا شاعر محفل میں ہو تو موڈ بننے میں دیر کیا لگتی ہے نثار صاحب۔ حکم کیجئے۔ بندی حاضر ہے۔ مجھے بھی کئی دن ہو گئے ہیں ریاض چھوڑے ہوئے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے سامنے جی بھر کر ناچوں اور گاؤں۔''

''لیکن میری جیب خالی ہے۔'' نثار نے اپنی حقیقت بیان کی۔

'' میرے فن کی صحیح داد تو دیں گے نا آپ۔ فن کار کو صحیح داد اگر مل جائے تو سمجھو دنیا جہاں کی دولت مل گئی۔ ناقدروں کی نوٹوں کی گڈیاں تو آپ کے سامنے ہی ابھی میں نے ٹھکرائی ہیں۔'' یہ کہہ کر نغمہ نے اپنے سازندوں کو فون کئے اور انہیں مجرے کی محفل کے لیے بلا لیا۔ اس رات اپنے محبوب شاعر نثار کے لیے نغمہ جی بھر کر ناچی اور ادا ادا پر داد وصول کرتی رہی۔

اس دن کے بعد کوٹھے پر پھر سناٹا چھا گیا۔ گھر کے اخراجات اور رخسار کی پڑھائی کے لیے اپنے زیور بیچتی رہی۔ ایک دن طبلہ نواز سلمان خاں نغمہ سے ملنے آئے اور خوشی خوشی بتانے لگے۔'' بی بی۔ میں نے شہر کے نکڑ پر ایک پان کی دکان کھول لی ہے۔ اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ گھر کا خرچ آرام سے چل جاتا ہے۔ اب تو طبلہ بجانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔''

نغمہ سوچنے لگی، طبلہ کا ایک باکمال فنکار جیتے جی مر گیا۔ ہندوستان میں دوبارہ ایسا طبلہ نواز کیا پیدا ہو سکے گا؟ شاید کبھی نہیں۔ سلمان خاں کی انگلیاں طبلہ پر جب بجلی کی طرح تھرکتیں تو ماحول میں جادو بکھر جاتا تھا۔ ایسا میٹھا اور سدھا ہوا ہاتھ ہر کسی کا نہیں ہوتا۔ اب وہی جادو بھرے ہاتھ پان پر کتھا چونا لگا کر جینے کا سادھن جٹانے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ فنکار کی تباہی اور بربادی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ سارنگی نواز شریف میں آئے اور نغمہ کو بتانے لگے۔ ''بی بی۔ خدا کا شکر ہے جب سے سبزی کی دکان لگانے لگا ہوں گھر کے سارے مسائل حل ہو گئے ہیں۔ سارنگی اٹھا کر میں نے گھر کے ایک کونے میں رکھ دی ہے۔ بڑی محنت سے سیکھا تھا یہ ساز لیکن کیا کریں بال بچے بھی تو پالنا ہیں۔'' یہ کہتے کہتے شریف میاں کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں جن میں اپنے فن کو چھوڑنے کا درد موجود تھا۔ نغمہ کا دل بھی بھر آیا۔ شریف میاں کے روپ میں ایک زندہ فنکار کی لاش اس کے سامنے موجود تھی۔

کبھی کبھی وقت عجیب وغریب کروٹیں بدلتا ہے اور زندگی ایک نئے انقلاب سے دوچار ہونے لگتی ہے۔ ٹھہرے ہوئے مسافر تیزی سے بھاگنے لگتے ہیں۔ نغمہ کے کوٹھے پر بھی ایک دن ایسی ہی ہلچل دوبارہ ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے گذرا ہوا زمانہ پلٹ آیا ہو۔ ہوا یوں کہ وزیر ثقافت کنور بھارت سنگھ کے یہاں سے نغمہ کو خاص طور سے ان کے بیٹے اجیب سنگھ کی شادی میں مجرا کرنے کی دعوت ملی۔ بھارت سنگھ نغمہ کے فن سے بخوبی واقف تھے اور کئی بار اس کی محفلوں کا لطف اٹھا چکے تھے۔

مجرے کی دعوت کیا ملی نغمہ خوشی سے ناچ اٹھی۔ فوراً سازندوں کو فون کئے گئے اور کوٹھے پر مجرے کی تیاری شروع ہو گئی۔ پرانی دھنوں کی نوک پلک درست کی گئی تو کچھ نئے مجروں کی تازہ دھنیں بھی بنائی گئیں جو نغمہ کے محبوب شاعر نثار نے خاص طور پر لکھے تھے۔ نغمہ سوچ رہی تھی کہ مجرے کی کامیابی کے بعد موقع ملتے ہی وہ وزیر ثقافت سے کہے گی۔ ''حضور آپ تو کلچرل منسٹر ہیں۔ آپ کا فرض بنتا ہے کہ ہندوستانی آرٹ اور کلچر کو تباہی اور بربادی سے بچائیں۔ آج مغربی رقص اور موسیقی ہماری آنے والی نسلوں پر اس قدر اثر انداز ہو رہے ہیں کہ ہم اپنے کلاسیکی سرمائے سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کو فروغ دینے کے لیے اقدام اٹھائے جائیں تاکہ ملک کے کئی فنکار تباہی اور بربادی کے شکار ہونے سے بچ سکیں۔''

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہی ہے۔ نغمہ نے بھی جو سوچا تھا وہ نہیں ہوا۔ بھارت سنگھ کے بیٹے کی شادی میں جب وہ مجرا کرنے کھڑی ہوئی تو اس کے پاؤں کی تھرکن میں وہ جادو نہیں تھا جو کبھی ہوا کرتا تھا۔ شریف میاں کی سارنگی بے سری بج رہی تھی اور سلمان خاں طبلے کی سنگت برابر نہیں کر پا رہے تھے۔ سب ہی کا ریاض چھوٹا ہوا تھا۔ سب بہک رہے تھے۔ سب سے زیادہ نغمہ کے پاؤں بہکنے لگے۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کی نظروں میں زمین و آسمان گھومنے لگے۔ وہ چکرا کر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ محفل کا مزہ کرکرا ہو گیا۔ یہ مجرا نغمہ کے لیے ذلت اور رسوائی کا سبب بن گیا۔ اپنی تہذیب اور تمدن کو بچانے کے لیے جو باتیں وہ بھارت سنگھ سے کہنا

چاہتی تھی وہ کہنے کا موقع ہی نہیں آیا۔ پروگرام کی یہ ناکامی اور ذلت نغمہ سے برداشت نہیں ہو سکی۔ گھر آ کر اس نے خودکشی کرنے کے لیے زہر پی لیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ نثار کو وقت پر معلوم ہو گیا اور فوراً نغمہ کو اسپتال لے گیا اور اس کی جان بچ گئی۔ دو تین دن نغمہ کو علاج کے لیے اسپتال ہی میں رہنا پڑا۔

اسپتال سے نغمہ جب گھر آئی تو ایک دن اس نے کوٹھے پر ایک انگریز کو دیکھا جو اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ رخسار گھر ہی پر تھی۔ اس نے ایک انگریز کو روانی کے ساتھ اردو بولتے ہوئے دیکھا تو اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ انگریز نے اپنا نام کرسٹوفر بتایا تھا۔ وہ ہالی ووڈ سے ہندوستان اس لیے آیا تھا کہ ہندوستانی مجرے کے فن پر ایک نایاب فلم بنا سکے۔ نغمہ کے پاس وہ اپنے اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے آیا تھا۔ رخسار اور نغمہ کے علاوہ عظمت بیگم سے بھی وہ بڑی دیر تک مجرے کے فن کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس درمیان اس نے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ وہ رخسار کو اپنی فلم کی ہیروئن بنائے گا اور اس سے ہی لکھنوی، بنارسی، بنگالی، لاہوری اور ہر طرح کے مجرے کروائے گا۔

نغمہ جب کرسٹوفر کو بتاتی ہے کہ رخسار کو تو مجرا بالکل بھی نہیں آتا ہے۔ اس نے یہ فن سیکھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی ہے کیونکہ اس کی دلچسپی تو شروع ہی سے انگریزی ڈانس اور موسیقی میں رہی ہے تو اسے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ وہ غصے میں آ کر رخسار کو کافی کھری کھوٹی سناتا ہے اور کہتا ہے:

''ہندوستانی رقص اور موسیقی اور موسیقی کی تباہی اور بربادی کی اصل ذمہ دار یہ نئی نسل ہے جو اپنی جڑوں سے اکھڑی ہوئی ہے اور بدیسی پرچھائیں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہی ہے۔ لیکن یہ نسل نہیں جانتی ہے کہ جو اپنی تہذیب و تمدن کو بھول جاتا ہے دنیا اسے بھول جاتی ہے اور پھر وہ زندگی کی بھول بھلیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔'' رخسار کے دل پر کرسٹوفر کے جملے تیر کی طرح لگ رہے تھے۔ نغمہ اور عظمت بیگم بھی چپ تھے۔ ان کے پاس بھی جیسے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

وہ پھر کہنے لگا۔ ''میں بڑی امید لے کر آیا تھا لیکن ناامید ہو کر لوٹ رہا ہوں۔ جو سرمایہ تم لوگوں کے پاس تھا تم نے اس کی قدر نہیں کی۔ نغمہ اس قابل نہیں ہے کہ وہ خود مجرے کے فن کی تکمیل کر سکے اور رخسار کو یہ فن آتا ہی نہیں ہے۔ اب مجھے واپس ناکام لوٹنا پڑے گا۔ میری ناکامی کا سبب آپ لوگ ہوں گے۔ کل ہی میں اپنے وطن واپس لوٹ جاؤں گا کہ اب یہاں رہنا بے کار ہے۔'' اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اٹھ کر کوٹھے سے نیچے اتر گیا۔ نغمہ کی آنکھوں میں آنسو تھے رخسار اور عظمت بیگم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

اس رات رخسار کو نیند نہیں آئی۔ اسے اپنی بھول کا احساس شدّت سے ہونے لگا۔ رات بھر وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی یہاں تک کہ فجر کی اذان کی آواز جب اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ اٹھ بیٹھی۔ غسل خانے میں جا کر اس نے وضو کیا اور مصلّہ بچھا کر نماز کے لیے کھڑی ہوئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد اس نے خدا سے دعا مانگی اور پھر پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر مجرے کا ریاض کرنے لگی۔ گھنگھروؤں کی آواز سن کر نغمہ اور عظمت بیگم بھی جاگ گئے۔ رخسار کے پاؤں کے گھنگھروؤں کی آواز دونوں کو بھلی لگنے لگی۔ دیر تک یہ آواز فضا میں گونجتی رہی۔

صبح ہوئی تو رخسار اس ہوٹل کی طرف چل پڑی جہاں کرسٹوفر ٹھہرا ہوا تھا۔ ہوٹل جا کر جب اس نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ تو ایئر پورٹ کے لیے کب کا نکل چکا ہے۔ وہ ٹیکسی پکڑ کر سیدھی ایئر پورٹ پہنچی اور فوراً کرسٹوفر کے نام کا اعلان کروایا کہ کوئی اس سے ملنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر میں کرسٹوفر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے آتے ہی رخسار سے پوچھا:

''اب یہاں کس لیے آئی ہو؟''

''میں تمہارا خواب پورا کرنے آئی ہوں مسٹر کرسٹوفر۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''لیکن تمہیں تو مجرے کا فن بالکل بھی نہیں آتا ہے۔'' اس نے سوال کیا۔

''یہ فن میرے خون میں ہے۔ میری رگوں میں ہے۔ میں اپنی ماں کی ہدایت میں تمہاری فلم کے لیے اس فن کی تکمیل کروں گی۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ نئی نسل جب اپنی تہذیب اور فن کو بچانے کی ضد پر آ جاتی ہے تو پھر اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ آپ فلم کی شوٹنگ کی تاریخ طے کیجیے میں اپنی ماں کی ہدایت میں مجرے کی تیاری کرتی ہوں۔'' رخسار بڑی سنجیدگی اور اطمینان سے بول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔ کرسٹوفر نے اس چمک میں رخسار کے عزم کو دیکھ لیا تھا۔ وہ فلائٹ چھوڑ کر اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے رخسار کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا۔ اسے اپنے آس پاس کے زمین و آسمان روشن ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

☆☆

گفتنی

ابراہم اشک 8 جولائی 1950 میں مدھیہ پردیش کے اوجین میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایم اے (ہندی ادب) کی ڈگری 1974 میں حاصل کی۔

آج صحافی، شاعر، ناقد، افسانہ نگار اور فلم رائٹر کی حیثیت سے ابراہیم اشک شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے کئی فلمی نغمے، مکالمے اور منظر نامے بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ ''کہونا پیار ہے''، ''کوئی مل گیا''، ''جانشیں''، ''اعتبار''، ''آپ مجھے اچھے لگنے لگے''، ''کوئی میرے دل سے پوچھے'' اور دھند'' وغیرہ فلموں نے ریکارڈ توڑ شہرت پائی ہے۔

ابراہیم اشک کی کتابیں ''الہام''، ''آگہی''، ''کربلا''، ''انداز بیاں اور''، ''تنقیدی شعور'' اور ''الاؤ'' وغیرہ نے قارئین اور ناقدین کو متوجہ کیا ہے۔ اصناف سخن ''لتلن'' اور ''چہارن'' کے موجد ہیں۔ فلمی اور ادبی ایک درجن سے زیادہ ایوارڈ انھیں مل چکے ہیں۔

میں نے ان کی گیت نگاری اور رباعی گوئی پر مضامین کی دو کتابیں ''ابراہیم اشک: نئے عہد کے گیت کار'' اور ''ابراہیم اشک: تجربہ کار رباعی گو'' مرتب کر کے شائع کی ہیں۔

اکیسویں صدی میں ابراہیم اشک افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئے تو انھوں نے تیرہ افسانے مجھے بھیجے جنہیں پڑھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ ان میں چھوٹا سا نقش نہیں ہے بلکہ تجربے کی اور عصری زندگی کے فلسفے کی جھلک نمایاں ہے۔ تب ایک خیال ذہن میں آیا کہ ان کے مشاہدے کی باریکی، اشارات اور کنایات اور چھوٹے بڑے معنی خیز واقعات کی پرکھ ہونی چاہئے تاکہ قارئین افسانے کے بطون میں جھانک سکیں۔ سبھی افسانوں کے تجزیہ کے لئے میں نے ناقدوں کو متوجہ کیا۔ اور اس طرح ایک تعمیر شدہ دنیا کا کینوس زیر مطالعہ ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ 1960—1970 اور 1980 کے بعد اُردو کے معیاری افسانوں کے فن میں، کہانی کے ڈھانچے اور واقعات کے Reception میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ ترقی

سید احمد قادری

تجزیہ — تہذیب

اردو افسانہ نت نئے تجربات سے گزرتا ہوا، آج جس مقام تک پہنچا ہے، وہ مقام اردو افسانوں کے لئے کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔

یلدرم سے لے کر عصر حاضر تک کے افسانہ نگاروں نے افسانوی ادب کو ہزاروں افسانے دئے۔ لیکن ان ہزاروں افسانوں میں ذہن پر بہت زور ڈالنے کے باوجود کچھ ہی ایسے افسانے ہیں، جو دل و دماغ پر نقش چھوڑ گئے ہیں۔

ایسے ہی نقش چھوڑ جانے والے چند افسانوں میں ابراہیم اشک کا ایک افسانہ ''تہذیب'' ہے۔ گرچہ ''تہذیب'' کے خالق کا نام افسانہ نگاروں کی چھوٹی یا بڑی فہرست میں نمایاں نظر نہیں آتا۔

ابراہیم اشک ایک ایسے فنکار کا نام ہے جن کے یہاں سوچ اور فکر کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے اور اپنی سوچ اور فکر کا وہ کبھی شاعری کے ذریعہ اور کبھی افسانے کے توسط سے اظہار کرتے ہیں اور چونکہ دونوں ہی اصناف کے فن پر انھیں قدرت حاصل ہے، اس لئے وہ اپنے افکار و اظہار میں کامیاب بھی ہیں۔

عصر حاضر میں بدلتے وقت نے جس طرح کروٹیں لی ہیں، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر جو منظر نامے سامنے آرہے ہیں، وہ بظاہر عصری تقاضوں کے غماز نظر آتے ہیں، لیکن جن لوگوں نے پرانی قدروں اور روایات کو دیکھا، سمجھا اور شدت سے محسوس کیا ہے، ان لوگوں کے لئے ٹوٹتے سماجی رشتے اور بکھرتے معاشرتی و تہذیبی اقدار بے چینی اور بے قراری کا سبب بن رہے ہیں۔

افسانہ ''تہذیب'' میں افسانہ نگار ابراہیم اشک سے ایسے ہی ایک سے ایک نازک مسئلہ کی نشاندہی کرا پنی فکری اور فنی عرفان و آگہی کا ثبوت دیا ہے ساتھ ہی ساتھ اپنے گہرے مطالعہ و عمیق

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

مشاہدہ کا بھی احساس کرایا ہے۔

ابراہیم اشک کا افسانہ ''تہذیب'' اپنے ابتدائی چند جملوں سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور جیسے جیسے یہ افسانہ آگے بڑھتا ہے انہماک اور تجسس میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ افسانہ کے تین مرکزی کردار عظمت بیگم، نغمہ اور رخسار تین عہد کی نمائندہ ہیں۔ نغمہ ایک ایسی طوائف ہے جس کے مجرے کی دھوم کبھی تھی— مجرا جو کبھی راجاؤں، نوابوں اور رؤسا کی شان سمجھا جاتا تھا، اس میں آداب، تمیز، تہذیب اور سلیقہ کی خوشبوئیں سمائی ہوئی تھیں— لیکن گزرتے وقت اور حالات نے نہ صرف اس کی خوشبوؤں کو چھین لیا، بلکہ ناقدری اور تہذیبی زوال نے اس انمول فنی نمونہ کو بے مول کر دیا۔

نغمہ شاندار ماضی دیکھنے کے بعد حال کی دھند میں ڈوبی زندگی گزار رہی ہے۔ ماضی کی یاد دلاتے رہنے کے لئے اس کی ماں عظمت بیگم موجود ہے، جو ماضی کی عظمتوں اور شاندار روایتوں کی امین ہے۔ نغمہ، جس کے ذہن میں اپنے حسین نغموں کی سحر کی یاد تازہ ہے، وہ چاہتی ہے اور اس کے دل میں یہ خواہش ہے کہ اس کی بیٹی رخسار اسی شاندار روایت اور تہذیب کی علمبردار بنے، وہ بھی مجرے کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں نغمگی بکھیرنے کے ساتھ ساتھ آداب اور سلیقہ جگائے۔ لیکن رخسار نئے زمانے کی پروردہ ہے اور زمانے کے ساتھ چلتے ہوئے وہ اپنے گھر کے شاندار روایتی مجرے کو اہمیت دینے کے بجائے مغرب زدہ موسیقی کی دلدادہ ہے، عصری حالات کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے نغمہ اپنی بیٹی رخسار کو اس کے لئے مجبور تو نہیں کرتی، لیکن اس کے دل میں ایک کسک ضرور ہے۔

نغمہ مجرے کی قدردانی کرنے والوں کی قدر کرتی ہے، دولت کے لئے وہ اپنے اس فن کے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیتی، یہی وجہ ہے کہ نئے زمانے کے نئے رئیسوں کی بگڑی اولادوں کی بدکلامی اور بدتمیزی سے وہ حد درجہ برافروختہ ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ نوجوان لڑکے نوٹوں کے بنڈل لے کر آئے تھے، نغمہ معاشی پریشانیوں سے گزر رہی ہے، پرانے زیورات فروخت کر کے وہ گھر کی ضرورت پوری کر رہی ہے، لیکن اپنی ان تمام مجبوریوں کے باوجود وہ مجرا کے فن کی تعظیم کرتی ہے، اسے رسوا نہیں ہونے دیتی ہے اور وہ ان نوجوانوں کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتی ہے، جو مجرے کی تمیز، تہذیب اور اس کی روایتی قدروں سے ناواقف ہیں۔

اس بے حد اہم اور معرکتہ الآراء افسانہ کے خالق ابراہیم اشک کے فکر و احساس میں کس قدر شدّت اور جدّت ہے، اس کا اندازہ اس افسانہ کے درج ذیل جملوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک

جگہ وہ لکھتے ہیں:

''وہ سوچنے لگی، فن اور تہذیب کی تباہی سے ملکوں کی تباہی کی ابتداء ہوتی ہے۔ تو کیا ہمارا ملک تباہی کی طرف جارہا ہے؟ یہ سوال نغمہ کو بار بار پریشان کرتا رہتا ہے۔''

یہ سوچ یا احساس یقینی طور پر نہ صرف نغمہ یا ابراہیم اشک کی ہے، بلکہ ہر اس انسان کی ہے، اس فنکار کی ہے، جو سماجی رشتوں میں پاکیزگی، معاشرتی اور تہذیبی قدروں کی آمادگی اور اخلاقی اصولوں پر یقین رکھتا ہے، وہ سماج، معاشرے اور تہذیب کو زوال پذیر ہوتے دیکھ کر، کرب اور گھٹن محسوس کرتا ہے۔

ابراہیم اشک نے موضوع، مواد، طرز بیان اور شدت احساسات و جذبات کی آمیزش سے اس افسانہ کو فکر و فن کی بلندی عطا کر دی ہے۔

اس افسانہ میں اس وقت ایک نیا موڑ آتا ہے، جب اس ملک کی پرانی قدروں، روایتی حسین نغموں اور پرکشش ناز و ادا سے بھرے مجرے کا قدرداں ایک انگریز کرسٹوفر اس موضوع پر تحقیق کرتا ہوا نغمہ کے یہاں آتا ہے اور ایک فلم بنانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے، جس کے لئے وہ نغمہ کی بیٹی رخسار کو ہیروئن بنانے کا اس لئے آفر دیتا ہے کہ وہ نغمہ جیسی اپنے زمانے کی مشہور و مقبول مجرا کی فنکارہ کی بیٹی ہے۔ لیکن اس وقت کرسٹوفر کو سخت حیرت اور مایوسی ہوتی ہے، جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجرا کی شہرت کی بلندیوں پر پہنچانے والی نغمہ کی بیٹی رخسار اس فن سے نابلد ہے۔ کرسٹوفر جب مجرے کی فنکارانہ اہمیت بتاتا ہے اور اس فن کی قدردانی نہ کرنے پر شدید افسوس کا اظہار کرتا ہے تو رخسار کو ندامت ہوتی ہے اور وہ اپنی ماں سے اس فن کو سیکھنے کے لئے اصرار کرتی ہے۔

ابراہیم اشک کا یہ مثبت رویہ ہے کہ وہ مجرے کے فن کو مرنے سے بچانے کے لئے رخسار کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت عصر حاضر میں فن اور فنکاروں کی جو ناقدری ہو رہی ہے، بہت سارے فن اپنے نقوش کھوتے جارہے ہیں، روایتی حسن ناپید ہوتا جارہا ہے، بہت ساری موسیقی، مصوری، نقاشی اور دیگر کئی فنون گزرے وقتوں کے یادگار بن کر رہ گئے ہیں۔ عہد حاضر میں دنیا مصنوعی روشنی کی چکاچوندھ میں اس قدر ڈوب گئی ہے کہ اسے اصلی اور معنوی کا فرق محسوس نہیں ہو رہا ہے اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ایسی اعلیٰ قدروں اور روایتی فنی نمونوں کی افزائش اور فروغ کے لئے ہماری حکومت بھی سنجیدہ نہیں ہے۔

افسانہ ''تہذیب'' احساسات و جذبات کو جھنجھوڑ دینے والا ایک بے حد کامیاب افسانہ

ہے۔اس افسانہ میں مجرا کی ناقدری ایک علامت کے طور پر بھی سامنے آئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس افسانہ کے ذریعہ ابراہیم اشک نے بہت سارے فن کے ختم ہوتے وجود کی طرف بڑے ہی مؤثر اور فنکارانہ انداز میں متوجہ کیا ہے۔

ایسے افسانوں، جن میں عصری مسائل کی ناہمواریوں کے ساتھ ساتھ روایتی قدروں کی پامالیوں کو خوبصورت انداز سے موضوع بنایا گیا ہو، کی اشد ضرورت ہے۔ابراہیم اشک اپنے اس افسانہ میں ایک اعلیٰ فن کار کے طور پر ابھر کر اپنی منفرد پہچان بنانے میں کامیاب ہیں۔

7, New Karimganj
Gaya-823001 (Bihar)

☆☆

شاہ بیگم

وہ زمانہ انگریزوں کا تھا۔ شبّو کا باپ ایک معمولی کانسٹبل تھا۔ تنخواہ کے علاوہ کوئی اوپری آمدنی نہیں تھی۔ کیونکہ غلام ہندوستان میں آزاد ہندوستان کی طرح نہ تو رشوت ہی لی جاتی تھی نہ ہی افسروں کو ایسی کھلی چھوٹ حکومت کی طرف سے حاصل تھی کہ عوام پر ظلم وستم ڈھانے کے لیے چاہے جیسی من مانی کرتے۔ پھر کانسٹبل کی مجال ہی کیا تھی کہ وہ رشوت لینے کے بارے میں سوچ بھی سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ جو بندھی ٹکی معمولی تنخواہ ملتی تھی اس میں شبّو کے گھر کے سکھ دکھ کا دارومدار تھا۔ شبّو کی ماں نے آج تک سونے کا کوئی گہنا نہیں دیکھا تھا۔ شادی کے وقت جو دو تین چاندی کے گہنے اسے ملے تھے وہی اس کی زندگی کا کُل سرمایہ تھا۔ جنہیں شبّو بڑی حفاظت سے رکھتی تھی۔ انہیں عید برات پر پہن لیتی اور پھر سنبھال کر ایک بکسے میں رکھ دیتی تھی۔ شبّو کا باپ تنگدستی کی وجہ سے اکثر پریشان رہتا تھا اور اس کا سارا غصہ اپنی بیوی پر اترتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا یہی سبب تھا کہ کانسٹبل ہونے کے باوجود وہ خود کو کسی تھانیدار سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی تھانیداری محض اپنے گھر تک ہی محدود تھی۔ آئے دن جھگڑے ہوتے اور کبھی کبھی تو شبّو کا باپ اس کی ماں کو اس بری طرح سے مارتا کہ اڑوس پڑوس کے لوگ توبہ پکار اٹھتے تھے۔ لیکن شبّو کی ماں آخر کہاں جاتی۔ ماں باپ پہلے ہی غریب تھے جیسے تیسے تو انہوں نے اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر کے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ چلو ایک انسان کا بوجھ کم ہوا۔ شبّو کی ماں اسی لیے شوہر کی مار پیٹ برداشت کرتی اور اسی کے سہارے پڑی رہتی۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ہی شبّو کی ماں حاملہ ہوگئی۔ شبو کا باپ بہت خوش تھا اسے پوری امید تھی کہ اس کے یہاں بیٹا ہوگا۔ اپنے بیٹے کا نام بھی اس نے پہلے ہی سے سوچ لیا تھا شاہ جہاں! یہ نام اس کے دماغ میں اس لیے آیا تھا کہ اس نے ایک بار تاج محل دیکھا تھا اور یہ عمارت اسے بہت پسند آئی تھی۔ اس وقت ایک گائیڈ نے اسے بتایا تھا کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہ جہاں

نے اپنی بیگم ممتاز محل کی یاد میں یہ تاج محل بنایا تھا جو پوری دنیا میں واحد محبت کی ایک بے مثال یادگار ہے۔ اس وقت شنو کے باپ نے سوچا تھا کاش وہ بھی شاہ جہاں ہوتا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ خدا نے اسے شاہ جہاں کیوں نہیں بنایا؟ پھر اسے اپنے ماں باپ سے بھی شکایت تھی کہ انہوں نے اس کا نام شاہ جہاں کیوں نہیں رکھا۔ اسے اپنے کانسٹبل ہونے پر جھلاہٹ ہونے لگتی لیکن وہ من مسوس کر رہ جاتا۔ اس نے اپنے ماں باپ کی غلطی کو سدھارنے کے لیے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ اپنے ہونے والے لڑکے کا نام شاہ جہاں ہی رکھے گا۔ لیکن شنو کے باپ کی یہ مراد بھی پوری نہ ہو سکی۔ دائی ماں نے جب اسے یہ بتایا کہ خاں صاحب ایشور نے آپ کو لکشمی دی ہے تو شنو کے باپ کے پاؤں کے نیچے سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔ وہ سوچنے لگا۔ اب اس نام کا کیا ہوگا جو اس نے لڑکا ہونے پر رکھنے کی سوچی تھی۔ اس کی زبان پر اچانک وہ نام گونج اٹھا ''شاہ جہاں۔'' پھر اسے خیال آیا کیا لڑکی کا نام بھی ''شاہ جہاں'' نہیں ہو سکتا؟ اس نے خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے آپ سے کہا شاہ جہاں نہ سہی میں اپنی لڑکی کا نام شاہ بیگم تو رکھ ہی سکتا ہوں اور اس نے اپنی بیٹی کا نام شاہ بیگم رکھ دیا۔ یہ نام جو بھی سنتا اسے بہت ہی عجیب سا لگتا۔ شاہ مذکر اور بیگم مونث۔ لیکن شنو کے باپ کے آگے کسی کی نہیں چلی۔ وہ بلا کا ضدی آدمی تھا۔ اپنی لاڈلی بیٹی کو شاہ بیگم پکارنے میں جب اسے دقت ہونے لگی تو اس نے اس نام کو چھوٹا کر دیا اور پیار سے وہ شاہ بیگم کو شنو کہنے لگا۔

جیسے جیسے شنو بڑی ہونے لگی اس کے جوہر کھلنے لگے۔ اپنے باپ ہی کی طرح وہ بھی بلا کی ضدی اور سرکش نکلی۔ اپنے نام ہی کی طرح مذکر اور مونث اس کی شخصیت میں ایسے گھل مل گئے تھے کہ کبھی کبھی ماں اس کی حرکتوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی تھی۔ اس کے شوق لڑکوں کی طرح تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے باپ کی وردی پہن کر ہاتھ میں ڈنڈا لیتی اور گھر میں ایسے گھومنے لگتی جیسے کوئی تھانیدار ہو۔ ماں بہت سمجھاتی کہ یہ چالے لڑکیوں کو زیب نہیں دیتے لیکن شنو کہاں ماننے والی تھی۔ اسے گڑیوں سے کھیلنے میں مزہ نہیں آتا تھا اس لیے محلے کے لڑکوں کے ساتھ وہ کنچے کھیلتی رہتی تھی۔ کبھی وہ کبڈی بھی کھیلتی اور اپنے کپڑے تار تار کر کے گھر لوٹتی۔ پڑھنے لکھنے میں ذرا بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ مدرسے میں بٹھایا تو مولوی کی شکایتیں گھر تک آنے لگیں، سرکاری اسکول میں داخلہ دلوایا تو اس کی شرارتیں اور زیادہ بڑھنے لگیں۔ بچوں کے ساتھ مار پیٹ، استادوں کے ساتھ بدتمیزی اور پڑھنے لکھنے میں صفر۔ کچھ سالوں تک یہی نتیجہ برآمد ہوتا رہا تو تھک ہار کر ماں باپ نے شنو کو گھر ہی میں بٹھانے میں اپنا بھلا دیکھا۔ گھر میں وہ ماں کے لیے وبال جان تھی۔ کبھی برتن

توڑتی تو کبھی تیل گرادیتی، کبھی چادر پھاڑ دیتی۔ ماں کچھ کہنے جاتی تو اس کے سر ہو جاتی اور لڑنے لگتی۔ اکثر باپ کے ہاتھوں سے گھر کا نقصان کرنے پر شبّو پٹتی بھی خوب تھی لیکن مار کھا کر اب اس کے ہڈے اس قدر مضبوط ہو گئے تھے کہ باپ کی مار پیٹ کا اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

کبھی کبھی شبّو کے والد اپنی چھوٹی بہن کو کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر لے آتے۔ وہ اپنے غریب بھائی سے بہت محبت کرتی تھی۔ بھابھی سے بھی اس کی خوب بنتی تھی۔ شبّو اپنی پھوپھی کی بڑی لاڈلی تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ شبّو بڑی ہی دکھلوئی اور چنچل لڑکی تھی۔ اس کی شوخیوں اور اداؤں پر پھوپھی واری جاتی تھی۔ شبو کی شرارتوں پر جب اس کی ماں کوئی تبصرہ کرنے لگتی اور فکرمند ہوتی تو پھوپھی ہنس کر انہیں سمجھاتی۔ ''ابھی بچپنا ہے بڑی ہوگی تو خود سمجھدار ہو جائے گی۔ ساری شرارتیں بھول جائے گی۔ ابھی بچی کی عمر ہی کیا ہے۔''

ماں کہتی۔ ''جیسے جیسے یہ بڑی ہو رہی ہے مجھے تو اس کی شادی کی فکر کھائے جا رہی ہے آخر کون پسند کرے گا اسے۔ اتنی بڑی ہوگئی ہے لیکن نہ تو گھر کی جھاڑو ہی ٹھیک سے نکال سکتی ہے نہ ہی برتن مانجھ سکتی ہے۔ کھانا پکانا تو دور کی بات ہے۔''

پھوپھی ہنس کر کہتی۔ ''بھابھی آپ خواہ مخواہ فکر کرتی ہیں۔ شبو کی شادی ایسی جگہ ہوگی کہ آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔ بارات ایسی دھوم دھام سے آئے گی کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔ بڑی نصیبوں والی ہے ہماری شبّو، جس گھر میں جائے گی راج کرے گی۔ آپ میری یہ بات یاد رکھنا۔''

شبّو کی ماں اپنی نند سے پوچھتی۔ ''کیا کوئی ایسا لڑکا ہے آپ کی نظر میں؟''

پھوپھی کہتی۔ ''وقت آنے پر اللہ سب اچھا کرے گا بھابھی آپ فکر نہ کیا کریں۔ ویسے میں نے ایک اچھا سا لڑکا دیکھ رکھا ہے اپنی شبّو کے لیے لیکن ابھی نہیں بتاؤں گی۔ وقت آنے پر ہی بتاؤں گی کہ وہ کون ہے۔'' وہ زوردار قہقہہ لگا کر کہتی اور شبو کی ماں کا جواب ہوتا:

''بیٹی تمہاری ہے۔ سب تمہیں ہی کرنا ہے۔ تمہارے بھائی کو تو جیسے کوئی فکر ہی نہیں ہے کہ بیٹی جوان ہوتی جا رہی ہے تو کچھ اس کا بندوبست بھی کرنا ہے۔ شادی بیاہ کوئی معمولی کام تھوڑے ہی ہے، ہزاروں کا خرچا ہے اور ہمارے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ تم تو جانتی ہی ہو معمولی تنخواہ ہے گھر کا خرچ بھی بڑی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔'' شبو کی ماں ٹھنڈی سانس لے کر کہتی۔

شبو کی پھوپھی کی زندگی عیش و آرام میں گزر رہی تھی، اس کے شوہر ہولکر اسٹیٹ میں سب انسپکٹر تھے۔ شہر میں ہر طرف ان کی شرافت اور ایمانداری کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ وہ بڑی ہی نیک دل اور مذہبی انسان تھے۔ خدا نے ویسی ہی بیوی بھی انہیں دی تھی جو شوہر کی فرماں بردار

اور گھر کو جنت بنائے رکھنے کا سلیقہ بخوبی جانتی تھی۔ ماں اور باپ اگر دونوں ہی مہذب اور شریف ہوں تو ان کی اولاد بھی اخلاق و محبت والی ہوتی ہے۔ خدا نے ان کو ایک پیارا سا لڑکا دیا جس کی ذہانت اور شرافت کے چرچے اس کے اسکول میں عام تھے۔ محلے والے اپنے بگڑے ہوئے بچوں کو سدھرنے کے لیے اس کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ باپ نے اپنے اس قابل بیٹے کا نام بھی محبوب احمد رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ ناموں کا اثر اکثر انسانوں کے کردار پر ہوتا ہے۔ محبوب احمد بھی اپنے نام ہی کی طرح ہر دل عزیز تھا۔ کتابوں سے اسے محبت تھی اور کھیل کود سے نفرت۔ جس کسی سے ملتا لوگ اس کی باتیں سن کر اس کی سنجیدگی کے قایل ہو جاتے۔ ماں اس پر واری جاتی اور خدا سے دعائیں کرتی کہ جیسا بیٹا اسے دیا ہے ہر ماں کو عطا کرنا۔ والد اس کی ترقی سے پھولے نہیں سماتے اور اپنے رب کا شکر ادا کرتے۔ ماں اور باپ دونوں ہی اپنے اس ہونہار لختِ جگر کو پیار سے لالو میاں کہتے تھے۔

لالو میاں اکثر چھٹیوں میں اپنی ماں کے ساتھ اپنے ماموں کے یہاں جاتے۔ وہاں ان کی مُنڈ بھیڑ ماموں کی لڑکی شاہ بیگم عرف شبّو سے بھی ہوتی۔ شبّو انہیں طرح طرح سے چھیڑتی اور لالو میاں اس کے نام کا مذاق اڑاتے۔ دونوں میں بالکل نہیں بنتی تھی۔ آپس میں خوب لڑتے۔ لالو میاں کہتے۔ ''اماں گھر چلو، یہاں میرا دل نہیں لگتا ہے۔ یہ لڑکی مجھے بہت پریشان کرتی ہے۔ پھر میرے پڑھنے لکھنے کے لیے بھی یہاں کچھ نہیں ہے۔''

ماں انہیں سمجھاتی۔ ''اتنا پڑھنا لکھنا اچھا نہیں ہے۔ زیادہ پڑھنے والے پاگل ہو جاتے ہیں کبھی کبھی کھیل کود کی طرف بھی دھیان دیا کرو۔ ابھی تو یہ عمر کھیل کود کی ہی ہے۔''

لیکن لالو میاں کی سمجھ میں ماں کی کھیل کود کی باتیں بالکل ہی نہیں آتی تھیں۔ ان کا کھیلنا کودنا اوڑھنا بچھونا تو بس کتابیں تھیں۔ ان کتابوں میں کبھی وہ مارکس کو پڑھتے تو کبھی سقراط اور پلیٹو کو، کبھی گوئٹھے کو پڑھتے تو کبھی غالبؔ، حافظؔ اور بیدلؔ کو۔ موجودہ دور کے شاعروں میں علامہ اقبالؔ ان کا پسندیدہ شاعر ہے جس کے کئی اشعار انہیں یاد ہیں۔ اپنے والد کی طرح لالو میاں بھی سچے اور اچھے مسلمان بننا چاہتے ہیں۔ وحدانیت پر ان کا پختہ ایمان ہے اور پیغمبر محمدؐ کی رہنمائی ان کی زندگی کے لیے مشعل راہ ہے۔ ماں باپ کی فرماں برداری وہ اپنا فرضِ عین سمجھتے ہیں۔ اب لالو میاں جوان ہو چکے تھے۔ ان کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ انہوں نے اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر لیا تھا۔

ماں باپ نے ایک دن لالو میاں کو اپنے سامنے بیٹھایا اور کہا ''بیٹا اب ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

لالومیاں اس کے لیے تیار نہ تھے۔لیکن مہذب اور شریف بچے یہ بھی جانتے ہیں کہ ماں باپ کا ادب کیا ہوتا ہے۔دھیرے سے بولے'' لیکن اماں۔ابھی ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔اس سلسلے میں تو ہم نے سوچا ہی نہیں ہے کہ ہمیں شادی کرنا ہے۔''

'' یہ کام تمہارے سوچنے کا نہیں ہے۔ہمیں گھر میں بہو چاہیے اور جہاں تک تمہارے پڑھنے لکھنے کی بات ہے تم خوشی سے پڑھو لکھو ہم اس پر پابندی تھوڑے ہی لگا رہے ہیں۔ہم تو بس ہمارے دل کے ارمان پورے کرنا چاہتے ہیں۔بس۔''ماں نے زور دے کر کہا۔

'' لیکن اماں۔میں ابھی اس موڈ میں نہیں ہوں۔آپ مجھے بی اے،ایم اے کر لینے دیں۔''لالومیاں نے ماں کو سمجھایا۔

''نہیں اتنے سال ہم انتظار نہیں کر سکتے۔پھر لڑکی کا بھی ہمیں خیال رکھنا ہے۔وہ جوان ہوگئی ہے۔''ماں بولی۔

'' کون سی لڑکی؟ کس سے کر رہے ہیں آپ میری شادی؟'لالومیاں بولے۔

'' جو کریں گے اچھا ہی کریں گے۔کنویں میں نہیں ڈھکیلیں گے تمہیں۔ہم تمہارے ماں باپ ہیں۔تمہارا اچھا برا سوچنا ہمارا فرض ہے۔''ماں بولی۔

'' لیکن وہ لڑکی ہے کون؟''لالومیاں نے اپنے والد کی طرف دیکھا۔

'' تمہارے ماموں کی لڑکی شاہ بیگم۔''والد نے خلاصہ کیا۔'' تمہاری اماں نے تمہارے لیے اسے پسند کر لیا ہے۔''

'' لیکن ابو وہ تو بالکل.....''لالو کہتے کہتے رک گیا۔

'' پڑھی لکھی نہیں ہے.....میں نے بھی تمہاری ماں سے یہی کہا تھا لیکن بیٹا ان کی دلیل کے آگے مجھے چپ ہو جانا پڑا۔یہ کہتی ہیں کہ میں کون سی پڑھی لکھی ہوں؟ پھر بہو سے ہمیں کوئی سرکاری ملازمت تو کروانا نہیں ہے۔ان کی بات بھی صحیح ہے۔پھر شبو دیکھنے میں اچھی خوبصورت بھی ہے۔تمہارے ساتھ اس کی جوڑی میرے خیال سے اچھی ہی رہے گی۔''والد بولے۔

لالومیاں سوچ میں پڑ گئے۔کچھ دیر خاموشی رہی جسے لالو کی ماں نے توڑا:

'' اب بول۔کیا کہنا ہے تیرا؟ لڑکی تیری دیکھی بھالی ہے۔تیرے ابو نے تو میری صورت بھی نہیں دیکھی تھی شادی سے پہلے۔آج خوش حال ہیں کہ نہیں۔پھر ہم تو سب دیکھ بھال کے کر رہے ہیں۔لڑکی پرائی بھی نہیں ہے۔گھر ہی کی ہے۔چاہے جیسے دبا کر رکھ سکتے ہیں۔'' ماں نے کہا۔

پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بعد ابراہیم اشک کی تیسری آواز زیادہ صحت منداور عوام سے قریب ہے۔

ایسے افسانے کے بیان میں براہ راست تبلیغ یا پیغام نہیں ہے بلکہ تفہیم کی فکر نمایاں ہے۔ بیانات قاری یا سامع کو ایک طرح کی خود اختیاری سچوئیشن میں لاکر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ حالات اور بیانات کے اثر کو تلاش کرے۔

ایسے افسانے میں یہ تبدیلی علاقائیت اور لایعنیت (Absurdity) کے بعد کی ہے اور اس میں ترقی کے امکانات اس لئے ہیں کہ قاری کے لئے خود اختیاری (Option) کی صورت پرانے افسانہ نگاروں کے ابلاغ سے بھی الگ ہے اور جدیدیوں کے خود میں گم ہوجانے والی ترکیب (Device) سے بھی جدا ہے۔ اس طرز میں نہ غصہ ہے، نہ جھنجھلاہٹ، نہ الزام تراشی، بس ایک گہرا تاثراتی بیان ہے جو ذہن کے خانوں سے ہوتا ہوا واقعات میں پھیل جاتا ہے۔

کچھ حد تک 1970 کے بعد بہت حد تک 1975 کے بعد اور بہت زیادہ حد تک 1980 کے بعد اُردو افسانے میں ذات کے اندر سفر کرنے اور یوسف گم گشتہ کو تلاش کرنے کا عمل بہت نمایاں نہیں رہا ہے اور بے راہ روی کے شکار افسانہ نگاروں نے بھی خود کو بدلنے کی کوشش کی، اعتدال پسندی کو اپنایا اور موضوع، اسلوب، تکنیک، زبان اور مواد ہر لحاظ سے نیا پن اور نئی آویزشوں کے مابین زندگی کی حرارت اور بوقلمونی پیدا کی ہے۔

افسانے میں ابراہیم اشک اکیسویں صدی کی نئی آواز ہیں۔ انھوں نے خود پر کسی بھی طرح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے بلکہ سارے دروازے، کھڑکیاں اور جھروکے کھول دینا چاہتے ہیں اور اپنے زمانے کے کھوکھلے ہوتے ہوئے باطن اور اطراف و جوانب میں، چشم بصیرت کو محسوس ہونے والی تاریکی کے باوجود شعلۂ تخلیق کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ ہمہ جہت زندگی سے ہم آہنگ ان کے افسانے حقیقی تخلیقیت کا منبع ہیں اور نئی جمالیات اور نئی اخلاقیات کی جستجو کا شعور بخشتے ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
Kohsaar/ Bhikanpur
Bhagalpur-812001
Ph: 0641- 2423633
Mob: 09430966156

☆☆

لالومیاں زندگی کی جنگ میں اس طرح کے حملہ سے بالکل انجان تھے۔ اب تک انھوں نے صرف کتابوں سے دل لگایا تھا۔ کسی لڑکی کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ ماں باپ کے سامنے آخر کیا جواب دیتے؟ انہیں تو ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح چپ رہنا تھا وہ چپ رہے۔ پلک جھپکتے ہی ان کی شادی شبو سے ہوگئی۔ ماں باپ نے خوب اپنے دل کے ارمان نکالے۔ شبو نے غریب باپ کے گھر سے قدم نکالا اور ایک خوش حال مہذب گھر میں قدم رکھ دیا۔ جہاں اب ساری عمر اسے گزارنا ہے۔

کوئی رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے لالومیاں اندر کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا دلہن گھونگھٹ نکالے پلنگ پر بیٹھی ہے۔ لالومیاں نے اپنی شیروانی اتار کر کمرے کی ایک کھونٹی پر ٹانگ دی اور پلنگ پر جا بیٹھے۔ کچھ دیر سوچتے رہے پھر جب ان کی نظر دلہن کے مہندی لگے ہاتھوں پر پڑی تو وہ ہاتھ انہیں بہت اچھے لگے۔ ان کی کشش لالومیاں کے دل کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ پہلی بار انہیں محسوس ہوا کہ کسی کے جسم کو چھونے میں بھی کوئی لذت ہوسکتی ہے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُن ہاتھوں پر رکھنا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے لالومیاں کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے ہاتھ کو بری طرح جھٹک دیا ہو۔ لالومیاں سناٹے میں آ گئے۔ ایسے تو آج تک کسی نے ان کے ہاتھ کو نہیں جھٹکا تھا۔ کچھ دیر وہ سوچتے رہے پھر وہ دلہن سے پوچھنے لگے۔

''مجھ سے کیا کوئی غلطی ہوگئی ہے جو تم نے میرا ہاتھ اس بری طرح سے جھٹک دیا ہے۔''

دلہن کے بدن میں کچھ ہلچل سی ہوئی اور وہ پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔

لالومیاں کو یہ اچھا لگا۔ یار دوستوں سے سنا تھا کہ سہاگ رات کے دن شعر و شاعری سنا کر دلہن کو خوش کیا جاتا ہے۔ یوں تو انہیں دیگر موضوعات پر کئی شعراء کے اشعار یاد تھے لیکن اس وقت اُنہیں کوئی ایسا شعر یاد نہیں آ رہا تھا جو حسبِ حال ہو۔ بڑی ہی مشکل سے ایک شعر یاد آیا تو دلہن کو سنانے لگے۔

''اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ
ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے''

''کیوں کیسا لگا'' لالومیاں نے دلہن کو چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''غصہ ہمارا دیکھا کہاں ہے آپ نے؟'' دلہن کی آواز آئی۔

''اچھا'' لالومیاں نے جواب دیا۔

''ہاں۔ بچ کر ہی رہئے ہمارے غصے سے۔'' دلہن نے کہا۔

''اچھی بات ہے۔ اچھا کیا جو آپ نے ہمیں ہوشیار کر دیا، اب ہم آپ کے غصّے کا خیال رکھیں گے لیکن ایک بات بتائیں۔ یہ غصّہ کرنا آپ نے سیکھا کہاں سے؟'' لالو میاں نے پوچھا۔

''ہمارے ابّا سے۔ وہ بھی بڑے غصّے والے ہیں۔ تھانیدار ہیں نا اس لیے۔'' دلہن بولی۔

''تمہارے ابّا۔ یعنی کہ ہمارے ماموں۔ لیکن وہ تھانیدار کہاں ہیں۔ وہ تو ایک کانسٹیبل ہیں۔'' لالو میاں سمجھاتے ہوئے بولے۔

''تھانیدار ہیں تھانیدار۔ معلوم نہیں آپ کو کہ تھانیدار کسے کہتے ہیں۔'' دلہن نے زور دے کر کہا۔

''مجھے معلوم نہیں ہے، ارے میرے والد خود تھانیدار ہیں اور میں نے خود دس کلاس پاس کی ہیں۔ بھلا میں یہ نہیں جانتا کہ تھانیدار کون ہوتا ہے اور پولس کانسٹیبل کسے کہتے ہیں؟'' لالو میاں نے کہا۔

''پڑھے لکھے سب پاگل ہوتے ہیں۔'' دلہن نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔

''کیا کہا۔ ذرا پھر سے کہنا تو'' لالو میاں کو لگا جیسے کسی نے ان کو گالی دی ہو۔

''پھر سے کہنے میں کیا ہے۔ کیا میں ڈرتی ہوں۔ جو جتنا زیادہ پڑھتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ پاگل ہو جاتا ہے۔ سمجھے۔'' دلہن نے جواب دیا۔

''شاید اسی لیے تم نے بالکل نہیں پڑھا۔'' لالو میاں نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ کسی تھانیدار کی بیٹی کو پڑھنے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' وہ بولی۔

''واقعی تم سچ کہہ رہی ہو۔'' لالو میاں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ انہوں نے سوچا اس جاہل عورت سے بحث کرنا بے معنی ہے۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ اسی درمیان انہوں نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کر جب اسے بانہوں میں بھرنا چاہا تو اُس نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ لالو میاں سے اس طرح اپنے آپ کو چھڑایا کہ وہ پلنگ سے زمین پر جا گرے اور مارے درد کے ان کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس منظر کو دیکھ کر دلہن بے تحاشا ہنسنے لگی۔ لالو میاں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اُنہیں آج اپنی قسمت پر رونا آ رہا تھا۔

یوں ہی روتے روتے چار دن گزر گئے۔ پھر چار مہینے گزرے اور پھر چار سال گزر گئے۔ شاہ بیگم دو بچّوں کی ماں بن گئی۔ اُس کی ضد اور جہالت نے ایک جنت جیسے گھر کو جہنم بنا دیا تھا۔ سسرا گر کچھ کہنے جاتے تو وہ اس طرح بدتمیزی سے پیش آتی کہ وہ مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتے۔ بہو کی زبان درازی سے تنگ آ کر انہوں نے اسے کچھ بھی کہنے سے توبہ کر لی تھی۔ ساس کا بُرا حال

ہوگیا تھا۔ وہ بیچاری گھر کا سارا کام کرتی۔ دونوں بچّوں کو سنبھالتی نہلاتی، ان کے کپڑے دھوتی، کھانا بناتی، اپنے شوہر اور بیٹے کا خیال رکھتی اور جیسے تیسے اپنے بھائی کی بیٹی کو نباہ رہی تھی۔

لالو میاں سے ماں اگر شیّو کے بارے میں کچھ کہنے جاتی تو وہ دامن جھٹک کر صاف کہہ دیتے۔ ''اماں۔ میں نے تو منع کیا تھا آپ ہی نے میری یہ شادی اپنی مرضی سے اپنے بھائی کی لڑکی سے کروائی ہے۔ اب میں کیا کروں؟'' ان کی بے بسی کا عالم وہی جانتے تھے۔ دوسرا کوئی ان کی جگہ ہوتا تو پاگل ہو جاتا یا پھر خودکشی کر لیتا لیکن لالو میاں نے اپنے تمام انتشار کو علم و ادب کی راہ پر ڈال دیا۔ انہوں نے انٹر پاس کیا۔ بی اے کی تیاری کرنے لگے۔ اسی درمیان دو سال کے لیے وہ بحرین چلے گئے۔ لالو میاں کی ماں کی زندگی عذاب بن گئی تھی۔ بیٹا تو ان سے ناراض تھا ہی اب شوہر کا رویہ بھی ان کے لیے سخت ہو چلا تھا۔ وہ کہتے۔ ''تم نے اپنے بھائی کی جاہل بیٹی کو میرے گھر میں لا کر اسے جہنم بنا دیا ہے۔ مجھ سے اپنے بیٹے کی حالت نہیں دیکھی جاتی ہے۔ اسے کیا ساری عمر اس آگ میں جلنا ہوگا؟ تم نے اچھا نہیں کیا لالو کی ماں۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکی اس قدر ضدی اور جاہل گنوار ہے ورنہ میں اپنے بیٹے کی زندگی برباد نہیں ہونے دیتا۔''

اور لالو میاں کی ماں سوچتی پتا نہیں اللہ نے اُسے اُس کے کس گناہ کی ایسی سزا دی ہے کہ گھر کے ہر فرد کا چین اور سکون برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ کچھ سال اور گزر گئے۔ لالو میاں بحرین سے واپس آ گئے۔ بی اے کیا پھر ایل ایل بی کر کے ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ ریاضت اور ذہانت ہر میدان میں اپنی منزلیں خود پیدا کر لیتی ہیں۔ لالو میاں دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔ جو کیس بھی وہ ہاتھ میں لیتے خدا اس میں انہیں کامیابی عطا کرتا۔ اب وہ کورٹ اور دفتر میں اس قدر مگن رہنے لگے کہ گھر رات دیر سے لوٹتے۔ تھکے ہارے آتے۔ کھانا جیسا بھی ان کے سامنے آتا کھا کر سو جاتے۔ کبھی کوئی شکایت لب پر نہیں لاتے کہ وہ اچھی طرح اس راز کو جان گئے تھے کہ ایک جاہل عورت سے کوئی بھی اپنے دل کی بات منوانا بے معنی ہے۔ وہ تو اپنی ضد میں وہی کام دوہراتی ہے جو اس کے شوہر کو پسند نہ ہو۔ اکثر ان کے کھانے میں کنکر آ جاتے۔ پینے کے پانی اور چائے کے کپ میں بال نکلتے۔ بغیر دُھلی ہوئی پلیٹیں اور گلاس اُن کے سامنے رکھ دیئے جاتے لیکن وہ خدا کا بندہ اُف تک نہیں کرتا۔

شیّو اب چار بچّوں کی ماں ہوگئی تھی۔ اس کا پھوہڑ پن دنوں دن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ لالو میاں کے چہرے پر اس لیے ہر وقت مسکان کھلی رہتی تھی کہ گھر میں نہ سہی تمام شہر میں ان کے نام کا سکّہ چلنے لگا ہے۔ وہ کئی اسکول، کالجوں اور تنظیموں کے صدر ہیں۔ دنیا انہیں سر آنکھوں پر بیٹھاتی

ہے لیکن شاہ بیگم کی جہالت اُنہیں ٹھوکروں میں اُڑاتی ہے۔

ایک دن بچوں کو نہلانے دُھلانے اور گھر کے کام کاج کو لے کر ساس بہو میں جھگڑا ہونے لگا۔ ساس اپنے دل کا سارا غبار نکال دینا چاہتی تھی۔ بات اتنی بڑھی کہ شبو نے اپنی ساس کو اٹھا کر پٹخ دیا۔ اس کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ رات کو جب دیر سے لالو میاں آئے تو ماں نے بستر پکڑ رکھا تھا۔ معلوم کرنے پر بڑی مشکل سے ماں نے رو رو کر انہیں سب کچھ بتا دیا اور کہا'' بیٹا اب مجھ سے تمہاری بیوی اور بچوں کی اور خدمت نہیں ہوتی۔ جب تک میرے ہاتھ پاؤں چلتے تھے میں یہ کام کرتی رہی۔ اب میرا بڑھاپا اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے مجبوری ہے۔ کاش تم میری اس مجبوری کو سمجھ سکو گے۔''

لالو میاں کا دل بھر آیا۔ آنکھیں چھلک گئیں۔ زندگی میں پہلی بار اتنا غصہ آیا جتنا کبھی کسی پر نہیں آیا تھا۔ وہ شبو پر خوب برسے۔ ایک دو بار ان کا ہاتھ بھی اٹھا لیکن پھر انہوں نے خود پر قابو پالیا۔ چاروں بچے بری طرح رونے لگے۔ گھر میں آدھی رات کو ایک اچھا خاصا تماشا ہو گیا۔ لوگ اڑوس پڑوس کے جاگ اٹھے کچھ ان میں سے سمجھانے بھی آئے۔ اس رات سب کی آنکھ دیر سے لگی۔ صبح اذان کے وقت جب ماں کی آنکھ کھلی تو دیکھا چاروں بچے اور شبو کا کہیں پتا نہیں ہے۔ نہ جانے کس وقت وہ گھر چھوڑ کر اپنے والد کے یہاں چلی گئی۔ جو شہر سے دور ایک گاؤں میں رہنے لگے تھے۔ ملازمت اُن کی چھوٹ گئی تھی۔ معمولی پنشن ملتی تھی اب اسی میں گزارا ہوتا تھا۔ شہر کے اخراجات سے بچنے کے لیے انہوں نے گاؤں میں ایک چھوٹا سا گھر لے لیا تھا اور دونوں میاں بیوی اب وہیں رہتے تھے۔

دوسرے ہی دن لالو میاں کے والد بچوں کو لینے اپنے سمدھی کے یہاں گئے۔ شاہ بیگم کو انہوں نے بہت سمجھایا لیکن وہ کسی بھی طرح آنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے۔ لالو میاں کی ماں گئی لیکن وہ بھی شاہ بیگم کو منانے میں ناکام ہو کر واپس آ گئی۔ پھر کچھ قریبی رشتہ داروں کو بھیجا گیا۔ انہوں نے آ کر بتایا کہ وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے اور کہتی ہے کہ اس کے شوہر محبوب احمد عرف لالو میاں کی جتنی شہر میں عزت ہے اسے خاک میں ملا کر ہی اب دم لے گی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک دن نوٹس آ گیا۔ جس میں لالو میاں سے شاہ بیگم نے اپنے اور بچوں کے لیے اخراجات کا مطالبہ کیا تھا۔ پچاس روپے ماہانہ خرچ کے علاوہ اس نے مہر کے تین ہزار روپے بھی مانگے تھے۔

نوٹس ملا تو لالو میاں نے سوچا ایک جاہل عورت سے اس سے زیادہ امید بھی کیا کی

جاسکتی ہے۔ ان کی نظر میں اپنے چاروں بچے گھوم گئے۔ ماں انہیں ہر طرح سے سنبھال لیتی تھی۔ وہاں ان کا خیال کون رکھے گا۔ شبّو تو اپنا خیال بھی نہیں رکھ سکتی، بات بات پر بچوں کو مارنا پیٹنا، نہ جانے کیا دُرگت ہو رہی ہوگی بیچاروں کی۔ بچوں کا یہ خیال آتے ہی وہ من مسوس کر رہ گئے۔ کوئی اور ہوتا تو طلاق نامہ بھیج کر اس عذاب سے آسانی سے نجات حاصل کر لیتا لیکن انہیں بار بار بچوں کا خیال آرہا تھا۔ وہ شاہ بیگم کو بچوں کے حق میں معاف کر دینا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے پھر اپنے چند عزیز رشتہ داروں کو اکٹھا کیا اور شبّو کو سمجھا بجھا کر واپس لانے کے لیے کہا۔ لیکن اُس نے اس بار بھی کسی کی نہیں سنی۔ لالو میاں اپنے بچوں کے لیے پچاس روپئے ماہانہ باقاعدگی سے بھیجنے لگے۔ دو سال اسی طرح گزر گئے۔ لالو میاں کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ کبھی کبھی اپنی شہرت اور عزّت کا خیال کرتے اور پھر جب انہیں اپنے بیوی بچوں کا خیال آتا تو ان کا دل دیواروں سے سر پھوڑ کر خوب جی بھر کر رونا چاہتا۔ شبّو کو ہر ماہ تنخواہ کی طرح اپنا اور بچوں کا خرچ چلانے کے لیے رقم مل رہی تھی اسے اب نہ شوہر کی پروا تھی نہ ہی اُس گھر کے افراد کی جو اُس کا اپنا گھر تھا۔ لیکن اس نے اس گھر کو اپنے ذاتی گھر کی طرح دیکھا ہی نہیں۔ کاش وہ اس گھر کے ذرّے ذرّے سے محبت کرتی تو وہ گھر اس کے لیے حقیقی معنی میں کسی بھی جنت سے کم نہیں ہوتا۔ لیکن اس دنیا میں خدا نے ہر عورت کو یہ سلیقہ کہاں دیا کہ وہ اپنے شوہر کے گھر کو رشکِ جنت بنا دے۔ جو عورتیں ایسی ہوتی ہیں اُن پر سلام بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔

دو سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد یہ امید بھی ٹوٹ گئی کہ شبّو دوبارہ اپنے بچوں کو لے کر شوہر کے پاس آئے گی اور اپنے ساس سسر کی خدمت کرنے کا فرض انجام دے گی۔ عزیز رشتہ داروں اور ماں باپ نے لالو میاں سے زور دے کر کہا کہ وہ اب دوسری شادی کر لیں۔ بڑی مشکل سے انہیں اس بات کے لیے منایا گیا۔ پہلے ان کے حصّے میں ماموں کی لڑکی آئی تھی، اس بار ان کی تقدیر میں ان کی خالہ کی لڑکی لکھی تھی۔ لیکن یہ لڑکی پڑھی لکھی اور مہذب تھی اور اس سے امید کی جاسکتی تھی کہ وہ لالو میاں کی زندگی میں سکون کا ایک ایسا جھونکا بن کر آئے گی جو اُن کے اب تک کے تمام رنج و غم کو بھلا دے گا۔ جلد ہی لالو میاں کا دوسرا نکاح ہو گیا۔ نکاح کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک دن صبح ہی صبح چاروں بچوں کو لے کر شبّو واپس آدھمکی۔

چاروں بچوں کا برا حال تھا۔ وہ اپنے دادا دادی سے مل کر بری طرح رو رہے تھے۔ نہ ڈھنگ کے کپڑے تھے بدن پر، نہ چہرے پر کوئی رونق۔ بچوں کو اس حال میں دیکھ کر دادا دادی کا دل لرز اٹھا۔ دونوں کی آنکھیں چھلک گئیں۔ لالو میاں کی ماں نے آخر روتے روتے اتنا تو کہہ ہی

دیا۔ ''یہ کیا حال بنا دیا ہے شبّو تو نے ہمارے جگر کے ٹکڑوں کا۔ اس کے روکھے سوکھے چہرے دیکھ دیکھ کر دل تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ کیا ان بچوں پر یہی ستم ڈھانے کے لیے تو یہاں سے گئی تھی۔''

شبو کے پاس اپنی ساس کی شکایت کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خود بھی بیماری کی وجہ سے اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ ٹھیک سے کھڑا رہنا بھی دوبھر تھا۔ لالو میاں نے اسے دیکھا تو سوچا اس عورت کی جہالت اور ضد نے اسے آخر کس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ وہ من ہی من خدا سے دعا مانگنے لگے ''اے اللہ میرے معصوم بچوں پر ان کی ماں کا سایہ برقرار رکھنا۔'' چھوٹی بی نے شبو کا جب یہ حال دیکھا تو لالو میاں سے کہا ''فوراً کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ ان کی حالت تو بہت ہی خراب نظر آرہی ہے۔''

لالو میاں فوراً شبّو کو شہر کے سب سے مشہور ڈاکٹر اکبر علی کے یہاں لے کر بھاگے۔ اکبر علی بڑا ہی مشہور ڈاکٹر تھا۔ دور دور سے مریض اس سے علاج کرانے آتے تھے اور جو کہیں اچھا نہ ہوتا اس کے علاج سے ٹھیک ہو کر سلامتی کے ساتھ گھر لوٹتا۔ یہ ایک اتفاق کی بات تھی کہ اکبر علی لالو میاں کا کلائنٹ تھا۔ وہ اس کا ایک کیس ہائی کورٹ میں لڑ رہے تھے اس لیے ایک ہی فون کرنے کی دیر تھی کہ اکبر علی نے فوراً شبو کو اپنے اسپتال میں داخل کر لیا تھا۔ معائنہ کرنے کے بعد اکبر علی نے لالو میاں کو بہت پھٹکارا کہ آخر اتنی دیر کیوں لگائی اگر دو چار دن اور لاپرواہی برتی جاتی تو پھر مریض کو سنبھالنا بہت ہی مشکل ہو جاتا۔ چھ ماہ تک مسلسل علاج چلتا رہا۔ لالو میاں نے پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ اکبر علی نے بعد میں ڈاکٹر مہاڈک سے علاج کرانے کی سفارش کی۔ وہاں بھی کافی روپیہ قربان ہوا۔ اس درمیان چھوٹی بی نے پوری طرح شبّو اور اس کے بچوں کا خیال رکھا اور لالو میاں سے اُس چیز کی فرمائش کرتی رہی جو اُن کے لیے ضروری تھی۔ لیکن بچّے اپنی سوتیلی ماں سے ہمیشہ ہی ناراض سے رہتے۔ چھوٹی بی ہر طرح سے انہیں خوش رکھنا چاہتی تھی لیکن اس عمل میں اسے ہر بار ناکامی ہی ہاتھ لگتی تھی۔ اس ناکامی پر وہ کبھی جھلاتی نہیں، مایوس نہیں ہوتی بلکہ اسے صبر کے ایک میٹھے گھونٹ کی طرح پی جاتی۔

ایک ڈیڑھ ماہ کے علاج کے بعد شبّو اسپتال سے گھر آگئی۔ چھوٹی بی نے اسے اپنی بڑی بہن کی نظر سے ہمیشہ دیکھا۔ علاج کے دوران اس کی اور اس کے بچّوں کی خوب خدمت کی لیکن اس خدمت کا کوئی بھی اثر نہ تو شبو پر ہوا اور نہ ہی اس کے بچّوں پر۔ اُن کے دل کا میل نہ دُھل سکا۔ شبّو نے چھوٹی بی کو ہمیشہ دشمن کی نظر سے دیکھا اور بیماری سے ٹھیک ہو جانے کے بعد یہ دشمنی دنوں دن بڑھتی ہی گئی۔ لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ گھر میں آئے دن جنگ کا سا ماحول رہنے لگا۔ لالو میاں اور ان کے ماں باپ تنگ آگئے۔ چھوٹی بی نے ہر طرح کی ذلت کو شوہر کے لیے برداشت

کیا اور کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کی۔ اسے رونا آتا تو اکیلے میں منہ ڈھانپ کر رو لیتی لیکن لالو میاں کے سامنے اس کا چہرہ ہر وقت کھلا کھلا سا رہتا۔ شبّو روز کسی نہ کسی بہانے سے چھوٹی بی سے جھگڑا کرتی یہاں تک کہ مار پیٹ کی نوبت بھی آنے لگی۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ شبّو کے ساس سسر کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ موقع غنیمت جان کر شبو اور اس کے بچوں نے مل کر چھوٹی بی کو خوب مارا پیٹا اور اُسے گھر سے نکل جانے کو کہا۔ رات میں یہ بات چھوٹی بی نے لالو میاں کے سامنے رکھی تو وہ کافی بھڑک گئے۔ گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ دوسرے ہی دن لالو میاں کے والد نے اپنے کرایہ داروں سے مکان خالی کرنے کے لیے کہہ دیا۔ لالہ سدا ما پرساد اور ماسٹر نگم برسوں سے ان کے مکان میں رہتے تھے اور وقت پر کرایہ ادا کرتے تھے۔ کبھی ان دونوں سے کوئی شکایت کا موقع ہی نہیں آیا۔ دونوں کرایہ داروں نے شبو کے مسئلہ کو پوری طرح سمجھتے ہوئے اسے اپنے ہی خاندان کا ایک مسئلہ سمجھا اور فوراً دوسرا گھر ملتے ہی مکان خالی کر دیا۔ اب شبّو اور اس کے بچوں کا ان دو مکانوں کو ایک کر کے اسے سلیقے سے بنا کے وہاں منتقل کر دیا گیا۔ چھوٹی بی لالو میاں اور ساس سسر کے ساتھ ہی رہنے لگی۔

لالو میاں شبو اور اس کے بچوں کا برابر خرچ اٹھاتے رہے۔ بچوں کی تعلیم کا پورا انتظام کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچّے بھی ان کی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے سماج میں اپنا کوئی ایسا مقام پیدا کریں کہ لالو میاں فخر سے سر اونچا اٹھا کر کہہ سکیں کہ یہ ان کی اولاد ہے۔ لیکن بچے پوری طرح اپنی ماں شبو کے کہنے میں تھے۔ ماں کی جہالت کا ان پر گہرا اثر تھا۔ باپ کی علمیت سے انہیں چڑ تھی۔ وہ ایک ایک کلاس میں تین تین سال فیل ہو رہے تھے اور اپنی جہالت کا نیا ریکارڈ قائم کر رہے تھے۔ بڑا لڑکا سعید انٹر میں تین سال تک فیل ہوا تو اس نے خود ہی آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ لالو میاں نے بہت سمجھایا لیکن بیٹا آگے پڑھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ لالو میاں سوچنے لگے اگر مجھ ایسے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ وکیل کا بیٹا انٹر بھی پاس نہیں کر سکے تو اس سے بڑی شرم کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لالو میاں نے سعید کی ترقی کا دوسرا راستہ نکالا۔ اپنے اثر و رسوخ سے بیٹے کو پائلیٹ بنانے کے لیے فلائنگ کلب میں داخلہ دلوایا۔ بے حساب روپیہ خرچ کیا لیکن وہ خدا کا بندہ کچھ سیکھنے ہی کو راضی نہ ہوا۔ ایک دن فلائنگ کلب والے اس سے اس قدر تنگ آ گئے کہ انہوں نے خود ہی اسے نکال باہر کیا۔ لالو میاں سر پیٹ کر رہ گئے۔

اب دوسرے بیٹے جمیل کا نمبر تھا۔ لالو میاں نے اسے پائلیٹ بنانے کے لیے ہزاروں روپیہ قربان کیا لیکن اس نے بھی باپ کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔ تب انہوں نے اسے ایک

بینک میں ملازمت پر لگا دیا جہاں دھیرے دھیرے اس کا جی لگ گیا اور لالو میاں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کا بیٹا کچھ تو کرنے کے قابل ہوا۔ تیسرے لڑکے خالد کو انہوں نے ایک کپڑا مل میں لگوایا وہ بھی زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ شاہ بیگم کی دونوں بیٹیاں جب جوان ہوئیں تو ان کی شادیاں بھی لالو میاں نے کروائیں اور اپنی حیثیت کے مطابق جو کچھ بھی بیٹیوں کو دے سکتے تھے دیا۔ تینوں لڑکوں کی ملازمت کا انتظام جب ہو گیا تو لالو میاں نے اُن کی شادیاں بھی رشتے ڈھونڈ کر کیں اور اس طرح جو ایک باپ کا فرض تھا اسے پورا کیا۔ ان فرائض کو پورا کرنے میں چھوٹی بی نے لالو میاں کا ہر طرح سے قدم قدم پر ساتھ دیا اور شبّو کے بچوں کو اس نے اپنے بچوں سے بھی زیادہ سمجھا، لیکن شبو نے چھوٹی بی کو اپنی چھوٹی بہن کا درجہ نہیں دیا بلکہ اس کو ہمیشہ دشمن ہی کی نظر سے دیکھا اور برتا۔ اس درمیان شبو کے ساس سسر کا انتقال ہو گیا تھا۔ چھوٹی بی کا لڑکا وکیل احمد اپنے باپ محبوب احمد عرف لالو میاں ہی کی طرح پڑھ لکھ کر ہائی کورٹ کا وکیل بن چکا تھا۔ اُس کی مقبولیت لالو میاں سے بھی زیادہ ہونے لگی تھی۔ لالو میاں اس کی کامیابیاں دیکھ سُن کر پھولے نہیں سماتے۔ وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے کہ ان کی مسند پر بیٹھنے والا ایک لائق بیٹا اسے دیا ہے۔ چھوٹی بی کی ایک لڑکی بھی تھی جس نے ایم اے پاس کیا تھا اور شادی کے بعد اس نے اپنے شوہر کے گھر کو جنت بنا رکھا تھا۔ شبّو کے بیٹوں کے برسرِ روزگار ہو جانے کے باوجود لالو میاں ہر ماہ ایک معقول رقم شبو کو خرچ کے لیے باقاعدگی سے دے رہے تھے اور اس طرح اپنے شوہر ہونے کا فرض ادا کر رہے تھے۔ اُن کے دل میں خدا کا خوف تھا۔ مذہب اسلام کو دل و جان سے مانتے تھے اس لیے اپنے کسی بھی فرض سے وہ کبھی بیگانہ نہیں ہوتے تھے۔

اس درمیان ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ چھوٹی بی کی لڑکی ماں بننے والی تھی۔ ماں باپ اسے گود بھرائی کی رسم ادا کر کے ساتویں مہینے میں اپنے گھر لے آئے۔ موقع غنیمت جان کر شاہ بیگم اور اس کے بیٹے بیٹیوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ چھوٹی بیگم کی لڑکی کو اس کے شوہر نے گھر سے نکال دیا ہے اور جلد ہی طلاق بھی دینے والا ہے۔ اس بات کو انہوں نے اس قدر ہوا دی کہ جلد ہی ساری برادری میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ لالو میاں، چھوٹی بیگم اور ان کے بیٹے وکیل احمد کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچی۔ سب کو بڑا غصہ آیا۔ ان لوگوں نے اپنے ہی گھر کی عزت کو اچھالا تھا۔ لالو میاں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کی سزا شبّو کو ضرور دیں گے۔ سزا دینے کے لیے اُن کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا کہ وہ جو خرچ کی رقم ہر ماہ شاہ بیگم کو دیتے آئے تھے اسے اب نہیں دیں گے۔ کیونکہ لالو میاں تو اس کا پورا خیال رکھتے تھے اور شبّو اُن کی اور اُن کی بیٹی کی بدنامی کرنے پر تُلی

ہوئی تھی اور انہوں نے شبّو کو خرچ دینا بند کر دیا۔

دو تین ماہ جب شبّو کو خرچ کے پیسے نہیں ملے تو اس نے لالو میاں کو نوٹس بھیج دیا۔ اس نوٹس میں اس نے جو خرچ کی رقم کا مطالبہ کیا تھا وہ تین گنا زیادہ تھی۔ چھوٹی بیگم کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے اور بیٹے وکیل احمد نے لالو میاں کو سمجھایا کہ جو رقم خرچ کی آپ دیتے رہے ہیں اسے واپس جاری کر دیں۔ کچھ عزیز رشتہ داروں کو بلایا گیا اور شاہ بیگم کو سمجھایا گیا کہ اسے ہر ماہ وہ رقم دے دی جائے گی جو لالو میاں اب تک اسے دیتے رہے ہیں۔ لیکن وہ نہیں مانی کیونکہ اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ نوٹس ملنے کے بعد لالو میاں ڈر گئے ہیں اور اس سے سمجھوتا کرنے چلے آئے ہیں۔ یہ سوچ کر شبّو ضد پر اڑ گئی کہ اب تو وہ ہر ماہ وہی رقم لالو میاں سے لینا منظور کرے گی جو اس نے نوٹس میں لکھی ہے یعنی جو وہ دیتے تھے اس سے تین گنا زیادہ۔ ورنہ وہ کورٹ میں کیس داخل کرے گی اور اس کے ذریعہ اپنا حق لے کے رہے گی۔ لالو میاں نے کہا ''جس کورٹ میں میری عزت ہے، شہرت ہے اُس کورٹ میں اگر مجھے بدنام کرنے کے لیے تم نے کوئی بھی غلط قدم اٹھایا تو ایک بات یاد رکھنا سعید کی ماں (شبّو) میں اسی روز تمہیں طلاق دے دوں گا۔ اس کے بعد نہ تو تم مجھ سے خرچ لینے کی حقدار ہو گی اور نہ ہی تم میری بیوی کہلانے کے قابل رہو گی۔ اس لیے جو قدم بھی تمہیں ضد میں اٹھانا ہے اس کے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا۔ میں تمہیں آج بھی اور زندگی کی آخری سانس تک اپنی بیوی مان کر جو اخراجات تمہیں دینا ہے وہ دیتا رہوں گا لیکن تم اگر کورٹ کچہری میں چوہتر برس کی عمر میں مجھے گھسیٹ کر بدنام کرنے کا منصوبہ رکھتی ہو تو میں اتنا بے غیرت بھی نہیں ہوں کہ اس کے بعد بھی تمہیں اپنی بیوی کا درجہ دوں۔ میں جا رہا ہوں۔ تم ایک بار اور سوچ لینا۔ تمہیں ہر ماہ وہ رقم اپنے اخراجات کے لیے چاہئے جو میں دیتا رہا ہوں یا تمہاری اور میری رسوائی اور بدنامی کے لیے طلاق۔ جسے ہمارے مذہب اسلام میں سب سے بری بات سمجھا گیا ہے۔'' یہ کہہ کر لالو میاں وہاں سے چل دیئے۔

شاہ بیگم نے کسی بھی عزیز رشتہ دار کی بات نہیں مانی۔ وہ لالو میاں کی تمام عزت اور شہرت کو مٹی میں ملا کر ایک زوردار قہقہہ لگانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک ایسا وکیل ڈھونڈا جو لالو میاں کا کٹر دشمن تھا۔ کئی کیس وہ ان کے مقابلے میں لڑ کر ہار چکا تھا۔ اس کے دل میں یہ خلش ہمیشہ برقرار رہتی تھی کہ کاش وہ ایک کیس لالو میاں کے خلاف لڑ کر جیت سکتا۔ وہ عیسائی تھا۔ اسلام اور مسلمانوں سے اسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ شاہ بیگم جب اس سے جا کر ملی اور اپنا منصوبہ بیان کی تو وہ یہ کیس بغیر کسی معاوضہ کے لڑنے کو تیار ہو گیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ گھر کا بھیدی تو لنکا ڈھا سکتا ہے

اور راون جیسا بلوان بھی ہار جاتا ہے تو یہ تو محبوب احمد خاں عرف لالو میاں ہیں۔ ان کی بیوی کے کاندھے پر بندوق رکھ کر انہیں آسانی سے ہرایا جاسکتا ہے اور اپنی دیرینہ خواہش کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ اس نے شاہ بیگم کو بہت حوصلہ دیا اور یہ کیس جلد از جلد کرنے کے لیے اکسایا۔ اسے صاف نظر آرہا تھا کہ اس جاہل عورت کے ذریعہ وہ اچھی طرح سے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرسکتا ہے۔

پھر وہ دن بھی آگیا کہ مسٹر مائکل نے شاہ بیگم کا کیس کورٹ میں داخل کردیا اور محبوب احمد خاں سے مہر کے تین ہزار کلدار سکے، کئی تولہ سونا، لاکھوں روپئے کے زیور، کئی ہزار روپئے کے کپڑے کا مطالبہ کیا گیا۔ اسی روز لالو میاں نے بڑے دکھی دل سے شاہ بیگم کی مہر کے تین ہزار روپئے اور عدّت کی مدّت کے اٹھارہ سو روپئے کل ملا کر چار ہزار آٹھ سو روپئے کورٹ میں جمع کر کے طلاق نامہ لکھ دیا اور مجسٹریٹ سے درخواست کی کہ اب اس معاملے کو ختم کیا جائے، لیکن مائکل اسے اس طرح اتنی جلدی ختم کہاں کرنے والا تھا، دوسرے ہی دن اس نے شہر کے مشہور اخباروں کے صحافیوں کو بلا کر شاہ بیگم کو ان کے سامنے بٹھادیا اور جو کچھ اپنے دل کا زہر اگلنا تھا ان کے سامنے اگل دیا۔ سب ہی نے شاہ بیگم کی تصویریں اتاریں اور اپنے اپنے حساب سے چٹپٹی کہانیاں بنا کر اخباروں میں شائع کردیں۔ ''ایک ۷۴ سال کے بوڑھے مسلمان نے ۷۰ سال کی بڑھیا عورت کو طلاق دے دی۔ عورتوں پر ظلم کی ایک ایسی کہانی جسے پڑھ کر ہر ایک کا دل لرز اٹھتا ہے۔'' پورے ملک کے اخباروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسلام دشمن تنظیمیں دوڑ پڑیں۔ شاہ بیگم کے عام جلسوں میں استقبال ہونے لگے۔ اسے ایوارڈ دیئے جانے لگے۔ اسلام اور مسلمانوں کو شاہ بیگم کے نام پر جی بھر کر کوسا جانے لگا۔ لالو میاں تمام شہر میں ہی نہیں تمام ملک میں بدنام ہو کر رہ گئے۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں یہ مسئلہ زور شور سے گونجنے لگا۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں جلسے ہونے لگے جلوس، نکلنے لگے۔ یہاں تک کہ ہندو مسلم فساد بھی ہونے لگے۔ ایک جاہل عورت کی آگ جو تمام عمر محبوب احمد کے گھر کو جھلساتی رہتی مائکل نے اس آگ کو اس قدر ہوا دی کہ پورا ہندوستان اُس میں جل اٹھا۔ محبوب احمد کے پاس صحافی آتے دو چار گھنٹے ان سے تفصیل کے ساتھ پوچھ تاچھ کرتے اور چلے جاتے۔ چار سطور بھی اپنے مضامین میں وہ نہیں ہوتی تھیں جو لالو میاں بتاتے تھے۔ جو کچھ بھی شائع ہوتا وہ یک طرفہ شائع ہوتا۔ یہ دیکھ دیکھ کر لالو میاں نے انٹرویو دینا ہی بند کردیا تھا۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میڈیا اس قدر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کیوں ہے کہ وہ اس کی مخالفت میں ہزاروں جھوٹ شائع کرنے کے لیے بخوشی تیار رہتا ہے جب کہ سچ اگر معلوم بھی ہو جائے تو اس سے گریز کرتا ہے۔

دھندہ

اُن دونوں کا تعلق دو الگ الگ برادریوں سے تھا۔ وہ دونوں بڑے ہی نکمّے اور نکھٹو تھے۔ کئی سال سے بے کار تھے۔ انھیں کہیں بھی نوکری نہیں ملتی تھی۔ وہ نوکری کرنے کے لائق بھی نہیں تھے۔ کئی دنوں سے وہ دونوں مل کر کوئی دھندہ کرنا چاہتے تھے۔ ایسا دھندہ جس میں محنت نہ لگے۔

آج وہ دونوں شہر سے دور بنی ایک صدیوں پرانی عمارت میں بیٹھے تھے۔ یہ عمارت کھنڈر بن چکی تھی صرف اس کے کچھ نشانات باقی رہ گئے تھے۔ شہر کے لوگ رات میں یہاں آنے سے ڈرتے تھے۔ یہ بات مشہور تھی کہ رات میں یہاں بھوتوں اور چڑیلوں کا ناچ ہوتا ہے۔ جو بھی رات میں ادھر آتا ہے اسے بھوت اور چڑیلیں مل کر مار ڈالتے ہیں اور اس کا خون پیتے ہیں۔ دن میں بھی کوئی ادھر نہیں آتا تھا۔ وہ دونوں فالتو تھے اس لیے اس ویران جگہ پر آ بیٹھے تھے۔

دھندے کے بارے میں سوچتے سوچتے انھیں ایک خیال آیا۔ جس نے ساری دنیا بنائی ہے، زمین آسمان بنائے ہیں، سب لوگ جسے مانتے اور پوجتے آئے ہیں کیوں نہ اسی کے نام پر دھندہ کیا جائے۔ اگر چل گیا تو زندگی بن جائے گی۔ انھوں نے سوچا وہ خدا کے نام کو بیچیں گے، ایشور کے نام کا بیوپار کریں گے، اگر مارکیٹنگ صحیح ہوگئی تو ان کے دھندے کو کوئی روک نہیں پائے گا کیونکہ وہ تو ملکوں کے قانون اور سمودھان سب سے اوپر ہے۔ اس کے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ سارے غیر قانونی کام اس کے نام پر کیے جا سکتے ہیں۔ نہ کوئی ٹیکس دینا پڑتا ہے، نہ کوئی اور جھمیلا ہے۔

دونوں نے دھندے کی شروعات کرنے کا پہلا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے تحت اُن دونوں کو اپنی اپنی برادری میں جا کر اُس فالتو جگہ کے بارے میں یہ مشہور کرنا تھا کہ وہ بھوتوں اور چڑیلوں کا نہیں بلکہ خدا کا گھر ہے۔ ہندوؤں کے لیے وہ مندر ہے اور مسلمانوں کے لیے مسجد۔

دوسرے ہی دن سے دونوں اپنی اپنی برادری میں جا کر پرچار کرنے میں لگ گئے۔

شاہ بیگم کا شور میڈیا کے ذریعہ اس قدر گونجا کہ جج نے جب فیصلہ سنایا تو اس نے مسلم پرسنل لال اور انڈین پینل کوڈ ۱۳ کا بھی خیال نہیں کیا اور فیصلہ شاہ بیگم کے حق میں دے دیا۔ یعنی طلاق کے بعد بھی اسے نان نفقہ دیا جائے۔ یہ چونکہ اسلامی شریعت کے خلاف کورٹ کا فیصلہ تھا اس لیے محبوب احمد خاں عرف لالو میاں نے اس کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی لیکن وہاں پتا چلا کہ بائی طاہرہ کیس کا فیصلہ اس کورٹ میں شریعت کے خلاف پہلے دیا جا چکا ہے۔ جس کی مسلمانوں کو خبر تک نہیں ہے۔ اسلام کے قانون کے ساتھ ایسی چھیڑ چھاڑ کیوں کی جاتی ہے یہ بات محبوب احمد کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ انہوں نے اپنا کیس ملک کے سپریم کورٹ میں داخل کیا تا کہ ہندوستان کے کانسٹی ٹیوشن کے عین مطابق اُنھیں انصاف مل سکے اور مسلمانوں کے قانون کے تعلق سے جو چھیڑ چھاڑ ہوئی ہے اس کا سُدھار بھی ہو جائے۔

شاہ بیگم کی عزت اور شہرت بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ہر دن اس کی تصویریں اخباروں میں شائع ہوتی تھیں۔ اخبار اس کے نام پر بکنے لگے تھے۔ بڑے بڑے لیڈر اس کے ساتھ تصویریں کھنچاتے اور اخباروں میں شائع کرواتے۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم نے بھی اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور دہلی بلا کر اس کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ مائنکل بہت خوش تھا کہ محبوب احمد خاں کو اس نے ہائی کورٹ میں بھی ہرا دیا تھا۔ کسی دشمن کو اگر گھر کی عورت کا سہارا مل جائے تو بڑے سے بڑے انسان کی بھی ہار ہو جاتی ہے۔ یہ تجربہ محبوب احمد خاں کو ہو گیا تھا۔

ایک دن شاہ بیگم کا اپنی بہو سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ بات اتنی بڑھی کہ ساس نے بہو کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔ شاہ بیگم کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو شائع کرنے والے صحافی اس واقعہ کی کھوج بین کرنے اس بار اس کے گھر نہیں آئے نہ ہی ایک ضدی اور سرکش ساس کے ظلم کی کہانی اخباروں میں شائع ہوئی۔ شاہ بیگم کی بہو کا رونا دھونا کسی کو نظر نہیں آیا کیونکہ مائنکل جیسا شاطر اور چالاک شخص اس کے پیچھے نہیں تھا۔ پھر لوگ شاہ بیگم کی شہرت اور مقبولیت سے ڈرنے بھی لگے تھے کہ وہ تو وزیر اعظم اور ملک کے بڑے بڑے لیڈروں تک جا پہنچتی ہے۔ وہ اگر اپنی بہو کو مار کر گھر سے نکال بھی دے تو جائز ہے۔

ہندوستان کے وزیر اعظم نے جب یہ دیکھا کہ ملک کے تمام مسلمان شاہ بیگم کے مسئلے پر ایک آواز ہو کر شریعت کی دہائی دے رہے ہیں۔ عدلیہ اور سرکار کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں تو انہیں سیاسی بساط پر اپنی ناکامی صاف دکھائی دینے لگی۔ کروڑوں ووٹ ان کے خلاف جانے والے تھے۔ آخر کار انہوں نے پارلیمنٹ میں ایک بل پاس کروایا جو سپریم کورٹ کے ذریعہ شریعت

کے خلاف دیئے گئے شاہ بیگم کیس کے تعلق سے تھا جس میں شریعت کی حمایت کی گئی تھی۔ کئی مفتی، مولانا اور علماء دین نے بھی شاہ بیگم کو سمجھایا کہ مر کر تمہیں خدا کو منہ دکھانا ہے، تمہاری وجہ سے تمام مسلم قوم اور مذہب اسلام کی بدنامی ہو رہی ہے۔ اس لیے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ کورٹ نے جو فیصلہ تمہارے حق میں دیا ہے اسے نامنظور کر دو۔ شاہ بیگم نے جب یہ دیکھا کہ کچھ لوگ اپنے مفاد کے لیے اسے استعمال کر رہے ہیں اور اس کی وجہ سے اسلام اور مسلمان بدنام ہو رہے ہیں تو اس نے اپنی ضد کو خدا اور رسول کے قانون پر قربان کر دیا۔ اس کے بعد ایک صحافی جب انٹرویو لینے آیا تو شاہ بیگم اس سے کہنے لگی:

''اسلام میں سب سے بُری چیز طلاق مانی گئی ہے۔ میں نے بھی طلاق کے بعد بُرا ہی محسوس کیا ہے، لیکن جب محسوس ہوا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نہ تو اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی۔ میری حالت آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے جیسی ہے۔ جس کے دل پر بیتتی ہے وہی جانتا ہے۔ بلڈ پریشر ہو گیا ہے۔ اب اس زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اور کچھ دن باقی ہیں جیسے تیسے کٹ جائیں گے۔''

''آپ کو ہر مہینے نان نفقہ کی کتنی رقم اس وقت ملتی ہے؟''

''خرچا پہلے ملتا تھا ۱۷۹ روپئے بیس پیسے ہر مہینے۔ لیکن جب سے میں نے سپریم کورٹ کا فیصلہ ماننے سے انکار کیا ہے تب سے یہ رقم لینا بند کر دیا ہے۔''

''سپریم کورٹ کا فیصلہ ماننے سے آپ نے انکار کیوں کر دیا؟''

''مجھے پہلے نہیں معلوم تھا کہ یہ فیصلہ مذہب کے خلاف ہے، شریعت سے باہر ہے۔ مجھے تو مفتی صاحب اور حاجی صاحب نے آ کر سمجھایا۔ مجھے بھی مر کر خدا کو منہ دکھانا ہے۔ میں نے جب سنا کہ یہ فیصلہ شریعت کے خلاف ہے تو میں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔'' شاہ بیگم بولی۔

صحافی نے کریدتے ہوئے پوچھا۔ ''سنا ہے کہ آپ پر مذہبی لوگوں نے کافی دباؤ ڈالا ہے ورنہ آپ انکار نہیں کرتیں؟''

''دباؤ نہیں ڈالا۔ ہاں انہوں نے سمجھایا ضرور۔ انہوں نے کہا خدا کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤ گی، تمہاری وجہ سے اسلام کی ناحق بدنامی ہو رہی ہے۔ لوگ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں بھی آخر مسلمان ہوں۔ میرا بھی خدا پر ایمان اور بھروسہ ہے۔ میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کرنا چاہتی جو خدائی قانون کے خلاف ہو اس لیے میں نے مفتی صاحب اور حاجی صاحب کی بات مان لی اور تب سے خرچا بھی نہیں لے رہی ہوں۔''

''تو کیا آپ مہر کی رقم بھی معاف کر دیں گی؟''

''نہیں، معاف کیسے کر دوں گی۔ میں تو مہر کی رقم لے کے رہوں گی۔ مہر کی رقم تین ہزار ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب چاندی کے کلدار سکے چلتے تھے وہی سکے مجھے چاہئے۔ مفتی صاحب اور حاجی صاحب نے یہ مہر مجھے دلانے کا وعدہ کیا ہے۔''

مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ شاہ بیگم نے صحافی سے کہا'' بھیا نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ خدا کے دربار میں ایک گنہگار کو حاضری دینا ہے۔ خدا حافظ۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

صحافی اپنے راستے پر چل پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا اب یہ معاملہ پوری طرح ختم ہو گیا ہے لیکن اس کی گونج دیر تک رہے گی۔ ایک معمولی گھر کا مسئلہ جب بڑا روپ لے لیتا ہے تو اس سے مذہب، قوم، ملک اور سماج سب ہی متاثر ہوتے ہیں۔ کچھ مفاد پرست اس سے فائدہ بھی اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ لوگ جھوٹ کی پیروی کریں گے۔ اس کا شور بلند ہوگا لیکن آخر جیت سچ ہی کی ہوگی۔ کیونکہ جو حق ہے وہی شریعت ہے، وہی خدا کا قانون ہے، وہی خدا ہے اور خدا سے بڑا نہ تو دنیا کا کوئی ہائی کورٹ ہے نہ ہی سپریم کورٹ۔

☆☆

مراق مرزا

تجزیہ — شاہ بیگم

ابراہیم اشک ایک کامیاب فلمی نغمہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی شہرت یافتہ شاعر بھی ہیں اور ان کی شعری کائنات بھی اتنی ہی فکر انگیز اور دلکش ہے جتنا کہ ان کے فلمی نغمات کی کہکشاں — علاوہ بریں وہ ایک روشن خیال افسانہ نگار بھی ہیں۔ زیر تحریر مضمون کا موضوع ان کا ایک بے حد مقبول افسانہ ''شاہ بیگم'' ہے۔ افسانہ شاہ بیگم جب میرے مطالعہ سے گزرا تو ایک پل کے لئے میرے فکر و شعور پر حیرت طاری ہوگئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے میں محترم اشک کو صرف ایک شاعر اور فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے جانتا اور پہچانتا تھا۔ وہ افسانہ نویسی کے فن پر بھی دست رس رکھتے ہیں اس حقیقت کا انکشاف شاہ بیگم کے مطالعہ کے بعد ہوا۔

بظاہر افسانے لکھنا آسان معلوم ہوتا ہے لیکن افسانہ نویسی کے اصول و قوائد اور فنی تقاضے کو ملحوظ رکھ کر افسانے تحریر کرنا نہایت دشوار کن امر ہے۔ کسی حادثہ یا واقعہ کو محض Fictionalize کر دینے کا نام افسانہ نگاری ہرگز نہیں ہے۔ افسانہ ہمیشہ کسی حقیقت کا عکس یا آئینہ ہوتا ہے۔ افسانہ کا ایک چہرہ ہوتا ہے، ایک جسم ہوتا ہے اور جسم کے اندر ایک روح بھی ہوتی ہے۔ کسی حادثہ میں یا واقعہ کو افسانوی شکل دینے کے عمل میں جسم اور چہرہ تو بن جاتا ہے مگر اکثر ایسے افسانے روح سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ایک کامیاب اور مؤثر افسانہ کے اجزائے ترتیب و تشکیل میں اچھوتے حادثات و واقعات کے ساتھ ساتھ دلچسپ پس منظر اور حقیقی کردار کا ہونا بھی لازمی ہے۔ کسی حادثہ یا واقعہ سے جنم لینے والے کردار فکری اور شعوری اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں۔ جب کسی مخصوص نظریۂ فکر کے بطن سے کوئی کردار وجود میں آتا ہے تو اس میں فکری وسعت اور بے پناہ توانائی ہوتی ہے اور ایسا کردار اکثر آفاقی اور لافانی بن جاتا ہے۔ تاریخ انسانی میں ایسے بے شمار کردار موجود ہیں جن کا جنم کسی مخصوص Idialogy کے زیر اثر ہوا تھا۔ لہٰذا یہی سبب ہے کہ ان کرداروں سے وابستہ کہانیاں آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہیں اور شاید رہتی دنیا تک زندہ رہیں گی۔

ابراہیم اشک کی کہانی کو جب ہم نقد ونظر کی میزان پر رکھ کر دیکھتے ہیں تو کہانی شاہ بیگم بلا اشتباہ اُردو ادب کی بے مثال کہانیوں کی فہرست میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے اور اس کا مطالعہ قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس اور سعادت حسن منٹو جیسے لافانی قلم کار کے طرز تحریر کی یاد تازہ کرتا ہے۔ افسانہ کے زبان وبیان پر غور کریں تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ابراہیم اشک کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ علاوہ بریں ان کے یہاں زندگی کے مشاہدے بھی ہیں اور قوم وملت کے تعلق سے ان کا ایک اپنا فکر ونظریہ بھی ہے جو انھیں دیگر افسانہ نگاروں کی قطار یا ہجوم سے الگ رکھتا ہے۔ ایک ادیب، شاعر یا مفکر کے لئے حیات وکائنات کے تعلق سے اس کا ایک ذاتی نظریۂ فکر ہونا از حد ضروری ہے کہ اس کے بغیر نہ وہ اپنی منفرد شناخت بنا سکتا ہے نہ ہی آفاقِ ادب پر اپنا کوئی نشان چھوڑ سکتا ہے۔

ابراہیم اشک نے زیر گفتگو افسانہ ''شاہ بیگم'' کے کرداروں کو اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے دیکھا اور برتا ہے۔ اپنی تخلیقی کاوشوں سے انھیں سجایا بھی ہے۔ کہانی کے مرکزی خیال میں بھی ان کے ذاتی نظریۂ فکر کے رنگ وعکس دیکھے اور محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ اس افسانہ کے دو اہم مرکزی کردار ہیں۔ شاہ بیگم عرف شبّو اور محبوب احمد عرف لالو میاں۔ آغاز سے لے کر اختتام تک کہانی انہی دو کرداروں کے ارد گرد گھومتی ہے۔

کہانی کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ شاہ بیگم ایک جاہل مطلق لڑکی ہے اور لالو میاں ایک تعلیم یافتہ نوجوان — لالو میاں کی ماں شاہ بیگم کو اپنی بہو کے روپ میں پسند کر لیتی ہے اور جب وہ یہ بات لالو میاں کو بتاتی ہے تو وہ ذہنی طور پر پریشان ہو جاتا ہے۔ اور اس رشتے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پاتا ہے۔ دراصل کہانی کے اسی موڑ سے مصنف اس کہانی میں مقصدیت اور معنویت پیدا کرنے میں کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ مسلم معاشرے میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بچوں کی پسند ناپسند کو ملحوظ رکھے بغیر والدین اپنی خوشی اور ترجیحات ان پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ لالو میاں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ ایک سعادت مند نوجوان ہے جس کے دل میں اپنے والدین کے لئے بے پناہ محبت وعزت ہے لہٰذا والدین کی خوشی کے لئے وہ شاہ بیگم کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھ جاتا ہے۔ بعد ازاں حسب توقع شاہ بیگم کی جہالت کے سبب شوہر بیوی اور ساس بہو کے درمیان تکرار اور مسائل کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں لالو میاں کی زندگی کلفت وکرب سے بھر جاتی ہے اور گھر جہنم بن جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ انسان اس عالم فانی میں اکیلا آتا ہے مگر اس کی پیدائش دو مختلف انسانوں

کے اشتراک سے ہوتی ہے لہٰذا وہ پیدا ہوتے ہی ایک خاندان اور معاشرے کا حصّہ بن جاتا ہے اور زندہ رہنے کے لئے اسے زندگی کے راستے میں قدم قدم پر خاندان اور معاشرے کی ضرورت درپیش آتی ہے۔ دراصل وہ رشتوں کی ڈور سے بندھا ہوا پیدا ہوتا ہے اور دنیا میں آنے کے بعد اس کے رشتوں کا دائرہ مزید وسیع ہو جاتا ہے۔ زندگی کی تمام خوشیاں انسان کو رشتوں سے ہی ملتی ہیں۔ ابراہیم اشک نے اس کہانی میں رشتوں کی اہمیت پر نہایت عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے اور ان کے کردار ہمیں یہ نصیحت دینے میں کامیاب ہیں کہ کبھی کبھی زندگی کا محض ایک غلط فیصلہ نہ صرف فرد بلکہ ایک پورے خاندان کی زندگیوں کو تباہی کی دلدل میں ڈھکیل سکتا ہے۔

کہانی کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ دونوں مرکزی کرداروں کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ یعنی دونوں کا بچپنا بھی بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ بچپن کے زمانے میں نہ کوئی اہم واقعہ رونما ہوتا ہے نہ ہی کوئی حیران کر دینے والا موڑ آتا ہے لیکن مصنف شاید علم نفسیات پر بھی قدرت رکھتے ہیں لہٰذا اُنہوں نے اِن کرداروں کو دورِ طفلی میں ہی نفسیاتی طور پر بالکل صاف وشفاف کر دیا ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انسان جس ماحول اور معاشرہ میں پرورش پاتا ہے، وہاں کے حالات اور عوامل ہی اس کا مستقبل طے کرتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ کسی بھی انسان کے لئے اُس کے Growing Years بے حد اہم ہوتے ہیں کہ انہی ماہ وسال میں اس کی ذہنی وفکری دنیا وجود میں آتی ہے۔ اس کی منفی یا مثبت شخصیت تعمیر ہوتی ہے اور وہ اپنے لئے غلط یا صحیح راستہ کا تعین کرتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اگر ہم غور کریں تو شاہ بیگم اور لالو میاں کے زمانہ نوعمری کا بیان اس کہانی کی ایک اہم اور بنیادی ضرورت معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دونوں کردار شروع سے ہی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم اشک کردار نگاری کے مشکل فن سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔

اس کہانی کا شمار بڑی کہانیوں کے زمرے میں اس لئے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے کردار آفاقی حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ کردار کل بھی ہمارے درمیان موجود تھے، آج بھی ہمارے آس پاس نظر آتے ہیں اور مستقبل میں بھی ان کا وجود باقی رہے گا۔ یہ کردار کی آفاقیت ہی ہوتی ہے جو کسی بھی کہانی کو لافانی بنا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہانی ہندوستانی سماج اور بالخصوص مسلم سماج کو ایک اہم پیغام بھی دیتی ہے۔ پڑھے لکھے مہذب مسلم گھرانوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچّے والدین کی خوشی پر اپنی خوشیاں اور ترجیحات قربان کر دیتے ہیں چاہے اس کے نتائج ان کی اپنی زندگیوں کے لئے تباہ کن کیوں نہ ہوں — جیسا کہ اس کہانی میں لالو میاں کا کردار کرتا ہے، لیکن

ایسا کرنا کیا درست ہے؟ لالو میاں کا کردار بغیر کچھ کہے قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیتا ہے۔ یہ بھی اس کہانی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ہر شاہکار کہانی میں بہت سی باتیں ان کہی ہوتی ہیں جنہیں سنجیدہ قاری آسانی سے محسوس کر لیتا ہے۔ اس کہانی میں بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ان کہی ہیں مگر قاری کے لئے ان کی تفہیم مشکل نہیں ہے۔ شاہ بیگم کو اپنی شریک حیات بنانے کے بعد لالو میاں کی زندگی جیسے ہی ذہنی الجھن اور مسائل کا شکار ہوتی ہے قاری اس کردار سے جذباتی

[redacted]

خوشگوار رشتہ قائم کرنے کی آرزومند ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کے شوہر کا گھر پھر سے جنت بن جائے مگر شاہ بیگم کی جہالت اور اکھڑ پن اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے جس کے باعث وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو پاتی ہے۔

آج سے تقریباً پندرہ سو برس قبل پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی میں علم کی اہمیت اور ضرورت کے تعلق سے کہا تھا کہ ''حصولِ علم کے لئے اگر چین بھی جانا پڑے تو جاؤ۔'' پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام میں پوشیدہ حقیقت کا عکس بھی اس کہانی میں نمایاں ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے۔ ''جہالت اور موت میں کوئی فرق نہیں۔'' اس قول کی سچائی بھی شاہ بیگم کے کردار کے ذریعہ محسوس کی جاسکتی ہے کہ علم کا نہ ہونا ہی شاہ بیگم کی بربادی کا سبب بنتا ہے اور اپنی جہالت کی وجہ سے ہی وہ اپنے شوہر کی زندگی اور اس کا گھر برباد کر دیتی ہے اور کہانی کے اختتام سے قبل جب کسی مفتی کے سمجھانے پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

لالو میاں کی دونوں شریک حیات کے بچّوں کے حالاتِ زندگی کا ذکر بھی کئی جگہوں پر آتا ہے جس کے باعث کہانی قدرے طوالت کا شکار ہوتی دکھائی پڑتی ہے۔ لیکن یہ کہانی کار کی ٹیکنیکل مجبوری ہے چونکہ افسانہ لالو میاں اور شاہ بیگم کے دور طفولیت سے شروع ہو کر عمر کے آخری پڑاؤ یعنی ضعیفی تک کا طویل سفر طے کرتا ہے چنانچہ بیانیہ میں ربط و تسلسل برقرار رکھنے کے لئے بچوں کے احوال زندگی کا تذکرہ ناگزیر تھا۔ دراصل اس افسانہ کے پلاٹ میں اتنی گنجائش تھی کہ اس پر ایک کامیاب ناول تحریر کیا جاسکتا تھا۔ چونکہ ابراہیم اشک ایک مشاق شاعر ہیں اور شاعری کی زبان اختصار طلب ہوتی ہے۔ شاعر کبھی کبھی غزل کے ایک شعر میں ایسا مضمون پیش کر دیتا ہے جس پر سو دو سو صفحات کی کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محترم اشک نے ناول کے اس پلاٹ کو نہایت خوش اُسلوبی سے افسانہ کے پیرایہ میں ڈھال دیا ہے۔ افسانہ کی ایک اور قابلِ غور خوبی اس کی زبان ہے۔ کہانی لکھتے وقت کبھی کبھی کہانی کار کردار کی زبان بھول جاتا ہے اور اسے اپنی زبان دے دیتا ہے۔ لہٰذا جب کبھی افسانوں میں کم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ کردار معیاری زبان بولتا ہے تو ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ اس کردار پر مصنف حاوی ہے کیونکہ معیاری زبان مصنف کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ ابراہیم اشک نے اپنی قابلیت اور علمیت کو کرداروں پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے اور بیانیہ کی زبان بھی بالکل سلیس رکھی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو کہانی عوام کی زبان میں لکھی جاتی ہے وہ مقبول عام ہوتی ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ منشی پریم چند کی شہرت و مقبولیت کے پیچھے بھی ان کی سادہ زبان کارفرما تھی۔ محترم اشک نے بھی اس کہانی میں بھاری بھرکم الفاظ کے استعمال سے

گریز کیا ہے اور کہانی کو وہی زبان دی ہے جسے عام قارئین آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

یہ افسانہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، قریب ایک یا ڈیڑھ دہائی قبل میڈیا کے ذریعے High Light کئے گئے ''شاہ بانو کیس'' سے Inspired ہے اور کسی واقعہ سے تخلیقی تحریک لینے کے عمل یا چلن کو میں قطعی برا نہیں گردانتا۔ منٹو کا لافانی افسانہ ''کھول دو'' بھی تقسیم ہند کے وقت کی کسی حقیقت کا ہی عکاس تھا اس لئے افسانہ شاہکار بن گیا۔ اس افسانہ میں ابراہیم اشک نے نظریاتی طور پر جو بات لفظوں کے استعمال کے بغیر کہی ہے وہ یہ ہے کہ ازدواجی رشتہ کے بگڑنے ٹوٹنے یا قائم رہنے کا انحصار شوہر اور بیوی کے درمیان فکر و خیال کی مطابقت پر ہوتا ہے۔ اگر دونوں کے خیالات ونظریات ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہوں تو یہ رشتہ دونوں کی زندگی کے لئے بارِ گراں بن جاتا ہے اور آج کے ترقی یافتہ کو زندگی بھر کے لئے شوہر اور بیوی کی صورت میں جوڑنے کا کام انجام دیتا ہے۔ مگر یہ رشتہ حقیقی معنوں میں تب تشکیل پاتا ہے جب مرد اور عورت کا دل ایک دوسرے کو قبول کر لیتا ہے۔ اور دل کے ملن کے لئے پہلے فکر و خیال کا ملنا بے حد ضروری ہے۔

شادی کے تعلق سے جارج برناڈ شاہ کا یہ خیال کہ '' Marriage is a legal prostitution'' (شادی قانونی طور پر جائز جسم فروشی کا کاروبار ہے) اسی تلخ حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ایک عورت اور مرد کے درمیان محض رسم نکاح یا اگنی کے پھیروں کی ادائیگی سے رشتہ نہیں بنتا۔ ان رسوم کی ادائیگی ایک شادی شدہ جوڑے کو محض جسمانی فرحت و مسرت حاصل کرنے کا لائیسنس عطا کرتی ہے اور جسمانی لذت و مسرت کا حصول اس لائیسنس کے بغیر بھی ممکن ہے کہ انسان اسے آسانی سے خرید سکتا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے عورت اور مرد کے درمیان مضبوط اور تاحیات قائم رہنے والا رشتہ مزاج اور فکر و خیال کی ہم آہنگی سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم شاہ بیگم اور لالو میاں کے ازدواجی رشتے پر تجزیاتی نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے درمیان حقیقی معنوں میں شوہر بیوی کا رشتہ تو بن ہی نہیں پاتا ہے۔ شاہ بیگم محض ایک بچہ پیدا کرنے کی مشین نظر آتی ہے کیونکہ لالو میاں چاہ کر بھی اسے پیار نہیں دے پاتا ہے۔ ایک طرح سے شاہ بیگم صرف بستر کی ضرورت ہے اور بستر ہی کے لئے استعمال ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ لالو میاں کے بچوں کی ماں بنتی چلی جاتی ہے۔ اس کے اور لالو میاں کے درمیان اتنی بڑی اور گہری فکری خلیج ہے کہ جس کا بھرنا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ ایک جاہل، ضدی اور بد دماغ عورت کے ساتھ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نیک صفت انسان کا نباہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس افسانہ کے ذریعے ابراہیم اشک یہ نصیحت یا پیغام دینے میں کامیاب ہیں۔

عورت اور مرد کے رشتوں میں اگر کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو معاشرہ اکثر مرد کو ہی اس کا ذمہ دار سمجھتا یا ٹھہراتا ہے۔ مگر سماج کا یہ Perception غلط ہے، جیسا کہ اس کہانی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ازدواجی رشتوں کے تمام معاملات میں ہمیشہ مرد ہی قصوروار نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی مسئلہ کی بنیاد عورت بھی ہوتی ہے۔ گو کہ شاہ بیگم کا کردار ہر زاویہ سے منفی اور حد درجہ نفرت انگیز ہے، اس کے باوجود ان پڑھ اور کم پڑھی لکھی مسلم خواتین کے لئے یہ کردار بے حد عبرتناک ہے۔ افسانہ نگار کا یہ بھی ایک کمال ہے کہ انہوں نے منفی کردار کے ذریعے بھی بہت کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ مشاہیر ادب کا ماننا ہے کہ شاعری وہ نہیں ہوتی جو شعوری طور پر کی جاتی ہے بلکہ حقیقی معنی میں شاعری وہ ہے جو شعور کی وادیوں میں بذات خود اترتی ہے اور شاعر صرف اسے ضبط تحریر میں لانے کا کام انجام دیتا ہے۔ اسی طرح میری نظر میں کہانی وہ نہیں ہوتی جو فکر و ذہن پر زور ڈال کر لکھی جاتی ہے بلکہ بڑی اور بے مثال کہانی ارضی افکار پر خود اُترتی ہے اور کہانی کار اسے لفظوں کا لباس پہنا کر یادگار یا شاہکار بنا دیتا ہے۔

چونکہ ابراہیم اشک کے یہاں مطالعہ ہے، مشاہدہ ہے، زندگی کے تلخ و شیریں تجربات ہیں اور حیات اور کائنات کے تعلق سے ان کا ایک فکری نظریہ ہے لہٰذا اُن سے مزید ایسے با مقصد افسانوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔

C-2, Unity complex,
Co. M.S., Yari Road, Versova
Andheri (W) Mumbai- 400061

☆☆